یا رب صل وسلم دائما ابدا علی حبیبک خیر الخلق کلہم

جواہر پارے

مؤلفہ

علامہ سید محمود احمد رضوی

ناشر مکتبہ رضوان لاہور

4082

چوراہے

حصہ اول

تحریر

علامہ سید محمود احمد رضوی

مدیر رضوان

اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم

جواہر پارے

حصہ اول

حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی مدیر رضوان
کے تحریر کردہ علمی ادبی تاریخی۔ مذہبی
اخلاقی۔ روحانی۔ اصلاحی۔ فقہی اور
تفسیری مضامین کا ایمان افروز باطل سوز
مجموعہ

ناشر
مکتبۂ رضوان
بیرون بھاٹی دروازہ لاہور

ھدیہ۔ چھ روپے =/6

ترتیب

جواہر پارے

ابتدائیہ ۔ حمد الٰہی درود و سلام بحضور نبوی ۲
ثنائے سرکار ہے وظیفہ ۴
پیاری باتیں ۶
ایمان اور کفر کا بیان ۹
اسلام کی ہمہ گیری ۹
عقیدہ کی اہمیت و ضرورت ۹
ایمان کے بغیر عمل بیکار ہے ۱۱
ایمان اور کفر کی تعریف ۱۲
ضروریات دین کی تعریف ۱۴
اسلام ایمان مسلم مومن میں فرق ۱۸
کفر کے اقسام ۲۰
کفر و ارتداد کا معیار ۲۰
قطعی الثبوت کے معنیٰ ۲۱
قطعی الدلالت کے معنیٰ ۲۱
ضروریاتِ دین میں تاویل مسموع نہیں ۲۲
کفر کے لئے تمام امور ایمانیہ کا انکار ضروری ہے۔ ۲۳
ارتداد، زندقہ اور الحاد کی تعریف ۲۴
فتویٰ تکفیر میں احتیاط ۲۴
جس کے کلام میں ۹۹ وجوہ کفر کے ہوں اس کا حکم ۲۶
مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ ۲۹
کفر و شرک کے دنیوی و اخروی احکام ۳۱
ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے ۳۴
توحید ۳۷
توحید کے عقلی دلائل ۳۷
توحید کے ایجابی و سلبی اجزاء ۴۰
شرک کی تعریف ۴۰
عبادت کے معنیٰ ۴۳
عبادت و تعظیم میں فرق ۴۳
اسلام میں عبادت کا تصوّر ۴۵
عبادت کا صحیح مفہوم ۴۷
عبادت میں اخلاص ۴۹
عبادت کا وسیع مفہوم ۴۹
القرآن الحکیم ۵۰
قرآن کی تعلیم و تلاوت ۵۱
اللہ کی سنّت ۵۲
اطاعتِ رسول کی کیفیت ۵۲

اخلاق و معاشرت

دین کے چار شعبے ۵۶
اخلاقِ حسنہ ۵۷
اخلاقی امراض ۵۹
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہنے والا جنتی ہے ۶۲
جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا اس کی نجات ہوگی۔ ۶۳
ایمان میں کمی و ضعف کا مطلب ۶۵
اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے ۶۶
عِلم و عرفان ۷۰
علم و عرفان ۷۰
خدمتِ خلق ۷۱
طہارت و پاکیزگی ۷۱
اسلام کیا ہے؟ ۷۲
ایمان احسان اور قیامت کا بیان ۷۴
ایمان کے معنیٰ ۷۵
ایمان باللہ ۷۵

ایمان بالملائکہ ۷۰
ایمان بالرسل ۷۰
اسلام کے معنیٰ اور اس کی حقیقت ۸۰
عبادت کے معنیٰ ۸۱
عبادت و تعظیم میں فرق ۸۲
شرک کی تعریف ۸۳
احسان کے معنیٰ ۸۵
ہر عمل میں احسان ۸۷
دنیا میں دیدار الٰہی ممکن ہے؟ ۸۷
قیامت کا اعتقاد ۸۹
علاماتِ قیامت ۸۹
قیامت کا علم کسی کو نہیں ؟ ۹۰
عمل کا ثواب خلوص نیت پر موقوف ہے ۹۸
ہجرت کے اقسام ۱۰۰
کیا فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ۱۰۱
ہجرت کا پسِ منظر ۱۰۳
ہجرت کے شرعی معنیٰ ۱۰۶
اعمال کی مقبولیت خلوص نیت پر موقوف ہے۔ ۱۰۷
فسادِ نیت کا انجام ۱۰۹
حدیث الاعمال بالنیت کے چند اہم فوائد و مسائل ۱۱۴
ایمان کے ثمرات و اثرات ۱۱۸
ایمان کے ستر شعبے ۱۱۹
نفاق کے معنیٰ ومفہوم کی وضاحت ۱۲۱
علاماتِ نفاق ۱۲۲
نفاق حقیقی کی تعریف ۱۲۳
نفاقِ عملی ۱۲۳
بعض منافقانہ اعمال وافعال ۱۲۴
جہاد سے گریز ۱۲۶
نماز میں سستی ۱۲۷
اذان کے بعد مسجد سے نکلنا ۱۲۷
اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ ۱۲۸
نماز کی پابندی ۱۲۸
قرآن میں نماز کے اوقات ۱۲۹
نماز کی شرطیں ۱۳۰
ہر نماز کے لئے وقت مقرر ہے ۱۳۱
صلوٰۃ کے معنیٰ ۱۳۴
نماز کی اہمیت ۱۳۵
تارک صلوٰۃ کافر ہے ۱۳۶
عبادت میں میانہ روی اختیار کی جائے۔ ۱۳۷
کثرتِ عبادت ممنوع ہے ۱۳۸
رزقِ حلال ۱۳۹
حصولِ رزق کی کوشش ۱۴۰
رزقِ حلال اللہ کا فضل ہے ۱۴۰
رزقِ حلال کی اہمیت ۱۴۱
عرصاتِ محشر میں حقدار مدعی ہوں گے ۱۴۲
رزقِ حلال کا مرکزی اصول ۱۴۴
معاملہ کا راست باز ہی آخرت میں کامیاب ہے ۱۴۵
اشیائے خوردنی میں ملاوٹ بدترین گناہ ہے۔ ۱۴۷
رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت۔ ۱۴۷
ناپ تول میں صحت کی اہمیت ۱۴۹
جھوٹی قسم ۱۵۰
اسلامی معاشرہ میں سلام کا مقام ۱۵۲
سلام کی اہمیت ۱۵۳

سلام کا وسیع پس منظر	[illegible]
سلام کے ضروری مسائل	۱۵۹
غیر مسلموں کو سلام نہ کیا جائے	۱۶۰
مصافحہ و معانقہ	۱۶۲
واقف اور اسکے احکام	۱۶۴
وقف کے معنی	۱۶۴
واقف کے اختیارات	۱۶۴
مسائلِ وقف	۱۶۶
قصیدہ بردہ شریف	۱۶۹
حُبِّ رسول شرطِ ایمان ہے	۱۷۳
حضور سے محبت	۱۷۳
حضور سے محبت کی کیفیت	۱۷۴
• غزوہ موتہ	۱۷۶
• توبہ	۱۸۲
• شوہر کے حقوق	۱۸۵
• دعا اور اس کے آداب	۱۸۸
• فسق کا نتیجہ	۱۹۲
اسلام میں قتل عمد کے احکام	۱۹۲
قتل عمد کی دنیوی و اخروی سزا	۱۹۲
قتل کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے	۱۹۳
معافی کا قانون	۱۹۳
قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔	۱۹۸
قتل کے اقسام اور اس کے احکام	۱۹۸
خون بہا کی مقدار	۱۹۹

اِہدَاء

سیّد المفسّرین سند المحدّثین رئیس الاتقیاء استاذ العلماء امام اہلسنّت مفتیِ پاکستان والدِ محترم سیّدی وسندی حضرت علّامہ ابوالبرکات **سیّد احمد** شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ امیر و شیخ الحدیث (دار العلوم حزب الاحناف پاکستان لاہور) کی خدمتِ اقدس میں جن کی تربیت سے راقم الحروف اس کارِ خیر کے لائق ہُوا

سیّد محمود احمد رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم

یہ کتاب حضرت علّامہ سید **محمود احمد** رضوی مدیر رضوان کے

ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اخبار و رسائل خصوصاً ماہنامہ **رضوان** میں شائع ہوئے

—— ایک عرصہ سے احباب کا اصرار تھا کہ ان مضامین کو یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک کے تحریر شدہ مضامین جمع تو کرلئے مگر انکو ایک جلد میں سمونا ناممکن اور طباعت کیلئے سرمایہ مہیّا کرنا مشکل نظر آیا۔ آخر طے پایا کہ ان مضامین کو متعدد جلدوں میں شائع کیا جائے۔ اندازہ ہے کہ تمام مضامین پانچ ضخیم جلدوں میں سما سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے ہم علّامہ رضوی کے مضامین کے ایک حصہ کو جسے خود علّامہ ہی نے ترتیب دیا ہے خدمتِ قارئین میں پیش کر رہے ہیں۔

—— یہ مضامین مختلف موضوعات پر مذہبی اخلاقی روحانی فقہی و تفسیری مواد پر مشتمل ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو کسی سوال کا جواب ہیں اور سوال کو غیر ضروری قرار دیکر حذف کر دیا گیا ہے۔

ان کی اشاعت سے مقصد صرف دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہے

اگر آپ نے ادارہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کتاب کی اشاعت میں حصّہ لیا تو انشاء اللہ العزیز اس کی دوسری جلد بھی ہدیۂ قارئین کردی جائے گی ۔

—— سیّد مختار اشرف رضوی

—— سیّد مصطفٰے اشرف رضوی

الحمد للہ رب العٰلمین

میری انتہائے نگارش یہی ہے
تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

حمد ہے ـــ اس خدا کیلئے جو رب العٰلمین ہے جو رحمٰن و رحیم کریم و حلیم اور علیم و خبیر ہے جس نے ایک امرِ کن سے کائنات بنائی اور انسان کو عزت و کرامت کا تاج پہنایا جس نے فضل و کرم اور جُود و سخا کے دریا بہائے اور ہماری ہدایت کیلئے اپنے محبوب کو مبعوث فرمایا۔

وہ ـــ قدوس ہے اس کے تقدس کے بیان کی کس میں طاقت ہے۔

وہ ـــ رحیم ہے اس کی رحمت اور کرم جود و عطاء کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء۔

وہ ـــ قاھر ہے اور اس کے قہر و غضب کی کس میں برداشت وہ ہنستی آنکھ کو رلاتا ہے اور مہکتے گلشنوں کو آن کی آن میں ویرانہ بنا دیتا ہے

وہ ـــ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسے چاہتا ہے کرتا ہے اس کے چاہے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا

وہ ـــ متکبر ہے بے نیاز ہے۔ مالک ہے خالق ہے رازق ہے

مختصر یہ کہ وہ رب العٰلمین ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں اور اسکی بندگی اور نیازمندی پر ہمیں ناز ہے

اے خدا اے مہرباں مولائے من اے انیسِ خلوتِ شبہائے من
اے کریم کارسازِ بے نیاز دائمُ الاِحسان شہہ بندہ نواز
اے کے نامت راحتِ جان و دلم اے کہ فضلِ تو کفیل مشکلم
اللہ اللہ زیں طرف جرم و خطاء اللہ اللہ زاں طرف رحم و عطا
ما خطا آریم و تو بخشش کنی نعرۂ اِنِّی غفورٌ مے زنی
اے خدا بہرِ جنابِ مصطفٰے چار یارِ پاک و آلِ باصفا
پُر کن از مقصد تہی دامانِ ما
از تو پذ رفتن زما کردن عطا

اعلیحضرت قدس سرہٗ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی حَبِیۡبِہِ الۡکَرِیۡمِ

درود ہو ـــــ ہستی کے اس نقش اول پر۔ اس رہبر اعظم اور رسولِ معظم پر۔ جو اپنے ہمراہ وہ نسخہ کیمیاء لائے جو قلزمِ حقائق اور مطلع الانوار ہے۔ جو کوثر علوم و معرفت اور مخزنِ الاسرار ہے جو حقائقِ رحمانی و معارفِ ربانی کا گنجینہ اور ہدایت و موعظت کا خزینہ ہے جو خداوند ذوالجلال کا آخری ضابطہ حیات ہے جس پر چل کر قوم مسلم دینی و دنیوی عروج حاصل کر سکتی ہے۔

سلام ہو ـــــ آسمانِ نبوت کے اس نیرّ اعظم پر جس کی پاک تعلیم نے تاریک قلوب روشن کئے پھوٹیں آنکھیں بینا۔ بہرے کان شنوا اور ٹیڑھی زبانیں سیدھی کر دیں۔ انسان کو انسان بنایا اور خدا تک پہنچایا۔ سنگلاخ زمینوں پر علم و عرفان کے چشمے بہائے اور ہر تفسیدہ لب کے سامنے جام کوثر لے کر خود آگے بڑھا۔

درود ہو ـــــ اس نبی اکرم رسول معظم سیدِ عالم نورِ مجسم احمد مجتبیٰ محمد مصطفٰی علیہ التحیۃ والثناء پر جو اللہ عزوجل کے خلیفۂ اعظم نائبِ اکبر اور اس کے آخری نبی ہیں جن کی ذاتِ ستودہ صفات پر نبوت و رسالت ناز کرتی ہے اور جن کی عظمت و رفعت شوکت و سطوت اور جبروت و جلال کے خطبے خود رَبّ العٰلَمِیۡن ارشاد فرماتا ہے۔

سلام ہو ـــــ اس نبی محترم پر جو امام الانبیاء اور خاتم النبیین ہے جس کا نام نامی اسمِ گرامی راحتِ جان ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہے جو کریم ہے رونقِ محفلِ وجود اور جلوہ طراز ہستؔ و بود ہے۔ جس کی تابش

خاکِ پا، غازۂ روئے قدسیاں ہے اور جس کی صورتِ حق نما وآئینۂ جمالِ حق ہے

درود ہو —— اس ہستئ مقدس پر جو جانِ کائنات اور رُوحِ بہار ہے جو اللہ کا محبوب اور سب کا مطلوب ہے۔ صحنِ عالم کی سرسبزی و شادابی اسی کے مقدس قدموں کی رہینِ منّت ہے وہ اگر کرم دیں تو ذرّہ آفتاب اور قطرہ سمندر بن جاتا ہے ؎

تم تو عرب کے چاند ہو پیارے تم تو عجم کے سورج ہو
دیکھو مجھ بیکس پر شب نے کیسی آفت ڈالی ہے

سلام ہو —— اس نبیِ محترم پر۔ جو رَحۡمَۃٌ لِّلۡعٰلَمِیۡن ہے۔ کوثر کا ساقی۔ جنّت کا قاسم۔ مملکت خداوندی کا مالک۔ غریبوں مفلسوں کا مددگار۔ یتیموں بیکسوں کا والی اور بے سہاروں کا سہارا ہے۔ جس نے ڈوبتی کشتیاں ترائیں۔ ہلتی نیویں جمائیں۔ روتی آنکھیں ہنسائیں۔ جو انسانیت کا غمگسار۔ اور ان کے حقوق کا محافظ و نگہبان ہے۔

مختصر یہ کہ وہ اللہ کا محبوب اور ساری کائنات کا مخدوم ہے ؎

لیکن رضا نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

محتاجِ کرم
سیّد محمود احمد رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

بحضور سراپا نور شافعِ یوم النشور سیّد کائنات، خلاصۂ موجودات، شہنشاہِ کونین، مالکِ دارین، سیّد المرسلین رحمۃ للعالمین۔ امام الاتقیاء، سرورِ انبیاء، **حبیبِ کبریا**۔ دُرِ اللہ المکنون عالم ما کان وما یکون۔ محسن کائنات۔ فخرِ موجودات۔ ھادیٔ سُبل ختم الرسُل۔ احمد مُجتبیٰ۔ مُحمّد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء۔

چابک قدم بسیطِ افلاک   والا گہرُ محیط افلاک ∴ خاکی و براَوج عرش منزل   اُمّی و کتاب خانۂ دل

سرورِ بنی آدم۔ رُوحِ روانِ عالم۔ وارثِ علومِ اوّلین۔ مورثِ کمالاتِ آخرین۔ قائدِ فوجِ اسلام۔ داغِ جبینِ اصنام۔ نکہت چمنستانِ ملکوت۔ اصلِ سربستانِ ناسوت۔ ثمرۂ سدرہ محبوبیّت۔ شگوفۂ شجرۂ مقبولیّت۔ شہبازِ آشیانِ قربت۔ طاؤسِ مرغزارِ جنت۔ فارسِ مضمارِ لاہوت۔ شہسوارِ میدانِ جبروت۔

میرے مولیٰ! جانِ کائنات بصد عجز و نیاز، بہ ہزار ادب و تعظیم تیری بارگاہِ اقدس میں اپنا اور قارئین کا سلام و نیاز عرض کرتا ہوں۔

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللہ   اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللہ
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نُوْرًا مِّنْ نُوْرِ اللہ   اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا عَرُوْسَ مَمْلَکَۃِ اللہ

اے محسنِ کائنات آپ کے فیض و کرم۔ جود و سخا سے ہم ناکارے مصیبت کے مارے دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے۔ دین و دنیا کا امن پایا۔ آرام کی نیند میسر آئی۔ آپ کے احسان کوئی بھول سکتا ہے؟

اے جانِ مسیحا۔ آپ کے قدومِ میمنت لزوم سے کفر کی جہانگیر تاریکی دور اور ظلمتِ باطل کافور ہوئی۔ حق کی روشنی سے عالم بقعۂ نور بنا۔ بے پر بے کس تاجور بنے۔ آپ نے خلقِ خدا کی کایا پلٹ دی۔ ؎

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے   کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اے چاند سے زیادہ روشن چہرے والے محبوب گدا نواز۔ عرب و عجم کے داتا۔ آپ ہی کے نام پاک سے ہمارے خون میں حرارت۔ دِل میں نور۔ آنکھوں میں سرور اور ایمان میں وفور پیدا ہوتا ہے۔

مالک و مختار آقا۔ آپ کی عطا سے گڈریے شہنشاہ۔ مریض مسیحا۔ جاہل عالم نادان فیلسوف بنے۔ آپ کی نظرِ کرم سے ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مشکلکشا ہوئے۔ ان انوار و برکات کا ایک چھینٹا اِدھر بھی۔

اے سبز گنبد میں آرام فرمانے والے۔ ساری اُمّت کے اعمال و افعال و کردار کی خبر رکھنے والے داتا۔ آپ کی اُمّت۔ محبوب اُمّت۔ اغیار کے تیروں کا نشانہ ہے۔ بیگانے تو دشمن ہی تھے۔ اپنے بھی پرائے ہوگئے۔ دین کے دشمن۔ ایمان کے لٹیرے۔ اب تیرے نام پاک پر حاصل کئے ہوئے اِس خطۂ پاک کو بھی ناپاک

بنانا چاہتے ہیں اور طرح طرح کے لباس بدل کر تیرے مخلص غلاموں کے ایمانوں پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ سرکار! ایک طرف تو تیرے مخلص خادم ان بے دینوں کے نرغے میں ہیں اور دوسری طرف بے شمار قزاق ہیں۔ بے دینی۔ بد اعتقادی زوروں پر ہے۔ تہذیب و شائستگی رخصت ہے۔ نہ دین سالم ہے نہ دنیا صحیح ہے۔ لہٰذا دستگیری کیجیے۔

اے جان کائنات۔ مسلمان بحیثیت عمل دین سے دور۔ شریعت سے نفور۔ اسلام سے بیزار ہے۔ فرنگی تہذیب و تمدن کا دلدادہ ہے۔ اسلام و قرآن سے ناآشنا ہے۔ اے محبوب ربّ العالمین انہیں ہدایت فرما۔ ہمارے سروں پر ان مقدس لوگوں کی حکومت قائم کر جو تیرے اور تیرے صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر گامزن ہوں۔ جو عہد صدیقی و فاروقی کو زندہ کریں۔

اے دشمنوں پر پھول برسانے والے رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْن ذلت و بربادی کے شعلے خرمنِ اقبال کو جلا رہے ہیں۔ آلام و مصائب کا ہجوم ہے۔ اتفاق و اتحاد معدوم ہے۔ انتشار ہے، اندھیرا ہے، جہانگیر اندھیرا، خلوص و مروّت، اخلاق و دیانت سے ہم کوسوں دور ہیں۔ ملی انتشار ہے، غداروں کا عروج ہے۔ دین کے دشمنوں کا غلبہ ہے۔ فحاشی و عریانی کا دور دورہ ہے۔ سینما آباد ہیں۔ مسجدیں ویران ہیں۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ اپنے بھی بیگانے ہیں۔ ابرِ رحمت کا کوئی چھینٹا!

جہالت کو انسانیت میں بدلنے والے آقا۔ شرک و بدعت کی قوتوں نے مجتمع ہو کر حملہ کر دیا ہے۔ کفر کے بادل آفتابِ توحید و رسالت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ **فاران پر چمکنے** والے انوار کی کوئی ضیاء!

تہذیب و شرافت کے خمار سے مخمور کرنے والے ہادی۔ آج مسلمان فیشن پرستی۔ جاہ طلبی۔ پردہ شکنی تن پروری۔ عیش پرستی کا شکار ہو رہا ہے۔ شرابِ تہذیب و معرفت کا ایک پیالہ۔

تیرے روضۂ مقدس کی جالیوں کا طواف کرنے والی نگاہیں۔ مجبور و مقہور نگاہیں۔ بیتابانہ وقفِ گریہ ہیں۔ تیرے نام پاک پر درود پڑھنے والے ہونٹ مصروفِ فریاد و بکا ہیں۔ سن اور جلدی سُن اور جلدی سن اور جلد خبر لے۔ ؎

زباں پہ کانٹے ہیں شاہِ کوثر! آفتوں سے چھڑا دو ہم کو — حسین کی پیاس کا تقدس ذرا سا پانی پلا دو ہم کو

ہماری ڈوبتی کشتی کے ناخدا! بس اب تیرا ہی سہارا ہے۔ تیرے نظرِ کرم کی امید ہے۔ حسنؓ و حسینؓ کا واسطہ۔ خاتونِ جنت کے غبارِ پا کا صدقہ۔ ایک نظرِ کرم! ؎

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی — دنیا پہ تیرا لطف صدا عام رہا ہے
کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں — خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

فریاد ہے فریاد ہے
اے کشتیٔ امت کے نگہباں

ثنائے سرکار ہے وظیفہ

ہم سیاہ کاروں پہ یارب تپش محشر میں سایہ افگن ہوں ترے پیارے کے پیارے گیسو

امیر المومنین سیدنا علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہ الکریم سے روایت ہے کہ حضور سیّدِ عالم نورِ مجسم احمد مجتبیٰ محمدِ مصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء اپنے دستِ مبارک میں اپنا ایک بال لیے ہوئے فرما رہے تھے

مَن اذی شَعَرَۃً مِّنْ شَعَرِیَ	جس نے میرے ایک بال کی بھی بے ادبی
فَالجَنَّۃُ عَلیہِ حرام۔	کی اس پر جنت حرام ہے۔

جامع صغیر ج ۲ ص ۱۴۰

حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں صحابہ کرام نے بحضور نبوی عرض کی یارسُول اللہ آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی۔

حضورؐ نے فرمایا۔

کنتُ نبیّاً وَ آدمُ بَینَ الرُّوحِ	میں اس وقت نبی تھا جب کہ آدم علیہ السّلام
والجَسَدِ	جسم اور رُوح کے درمیان تھے۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی جان ہے تو جہان ہے

جناب ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین سے پُوچھا۔ تمہاری عمر کتنی ہے ؟ جنابِ جبریل نے عرض کیا بخدا میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ حجابِ رابع میں ایک ستارہ ہر ستر ہزار سال کے بعد ظاہر ہوتا تھا میں نے اس کو بہتر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا

وَعِزَّۃِ رَبِّی اَنَا ذَالِکَ	اے جبرئیل مجھے اپنے رب کی عزت کی قسم
الکَوکَب ۔ جواہر البحار ص ۷۷۶	وہ ستارہ میں ہی تھا۔

نہ شمع جلتی نہ پھول کھلتے نہ دن نکلتا نہ رات ہوتی
جو وہ نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا وجود کون و مکان نہ ہوتا

جناب ابوہریرہؓ سے مروی ہے حضور خاتم النبین سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں پیدائش میں تمام نبیوں سے پہلا ہُوں۔

وَاٰخِرُھُمْ فِی البَعثِ	اور بعثت میں ان سے پچھلا ہوں

دھر میں تیری ذات پر ختم ہوئی پیمبری

امامِ ربانی مجددِ الف ثانی قدس سرہ السبحانی اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں ۔ ۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس لیے محبّت ہے کہ وہ محمد مصطفےٰ علیہ السلام کا رب ہے (مکتوب ۳۱۰ ص ۳۲۶ ج ۱) ○ تمام امتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم مملوک اور غلام ہیں (مکتوب ۶۴ ص ۱۶۹ ج ۳) ○ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت کسی بشر کی خلقت کی طرح نہیں بلکہ عالمِ ممکنات کی کوئی چیز حضور کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی ۔ کیونکہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا فرمایا ہے (مکتوب ۱۰۰ ص ۱۸۷ ج ۳

مغزِ قرآن جانِ ایمان رُوحِ دین
ہست حُبِّ رحمتہ اللعلمین ، (اقبالؒ)

محبّت کے اندر پالیسی اور چاپلوسی جائز نہیں کیونکہ محبّ اپنے محبوب کا دیوانہ ہوتا ہے وہ اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے محبوب کی مخالفت کی جائے وہ اپنے محبوب کے مخالفوں کے ساتھ کسی طرح بھی صلح پسند نہیں کرتا (مکتوب ۱۶۵ ص ۱۶۸ ج ۱

عالمِ شہادت میں حضورِ اکرم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلّم کا سایہ نہ تھا کیونکہ ہر شخص کا سایہ اِس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے ۔

چوں لطیف تراز وےئ	اور حضور علیہ السلام سے زیادہ عالم میں کوئی
صلی اللہ علیہ وسلم در عالم نباشد	چیز لطیف نہ تھی اِس لیے آپ کا سایہ
اوراسایہ چہ صورت دارد	کِس طرح ہوتا ۔

مکتوبات

یہ ہم کہتے ہیں دُنیا میں محمد آئے بے سایہ
خدا جانے محمد تھے کہ تھا سایہ محمّد کا

اللہ عزّ وجلّ نے اپنے محبوبِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا اے محبوب اگر تم کو پیدا کرنا منظور نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا ۔

لَوْلَاکَ لَمَا اَظْھَرْتُ	اگر تمہارا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا میں اپنا
الرُّبُوْبِیَّۃَ مکتوبات ص ۲۳۲ ج ۳	رب ہونا بھی ظاہر نہ فرماتا

نہ عالمِ ست وبود ہوتا نہ زندگی کا وجُود ہوتا
جہان کی تخلیق ہی نہ ہوتی جو حاصل دو جہان نہ ہوتا

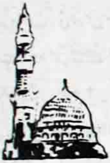

پیارے نبی
کی
پیاری باتیں

بہادر کون ہے؛

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الغضب ۔ (بخاری)

طاقت ور (بہادر) وہ نہیں ہے جو اپنے مقابل کو پچھاڑ دے وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت یا کسی مظلوم و بیکس کی حمایت کے لئے جو شخص طاقت ور دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اور اس پر فتح پاتا ہے وہ بہادر کہلاتا ہے۔ ایسے بہادر آپ کو سینکڑوں مل جائیں گے۔ حدیث مذکور میں ایسی بہادری کی نفی نہیں ہے بلکہ مقصدِ حدیث بہادری کے اعلیٰ مقام کو بیان کرتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھئے اور اب کلماتِ نبویہ پر غور کیجئے یہ اپنے اندر حکمتِ موعظت کی کتنی دنیائیں لئے ہوئے ہیں۔

مثل مشہور ہے غصہ حرام ہوتا ہے۔ غصہ میں نفس بے قابو ہو جاتا ہے۔ جذبات پر کنٹرول نہیں رہتا۔ قوتِ عقلیہ مضمحل ہو جاتی ہے اور انسان سے ایسے افعال صادر ہو جاتے ہیں جن پر غصہ اتر جانے کے بعد اسے ندامت اٹھانی پڑتی ہے اور اکثر اوقات اس کی تلافی ناممکن ہوتی ہے۔ قتل اور طلاق کے جرائم غصہ میں معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ کسی کی زندگی ختم ہوتی ہے اور کوئی عمر بھر کے لئے چھوٹ جاتا ہے۔ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا غصہ کے وقت اور ایسے نازک موقع پر جو شخص اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور جذبات پر کنٹرول کر لیتا ہے وہ بہادر ہے اور یہ بہادری کا اعلیٰ و ارفع مقام ہے۔

خورد و کلاں کے حقوق

لَیْسَ منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقِر کبیرنا ۔ (بخاری)

جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت یہ وہ سنہری اصول ہیں جن پر خورد و کلاں کے باہمی حقوق کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر بڑے اور چھوٹوں کے درمیان توازن قائم ہو جائے تو بزرگوں عزیزوں، آقاؤں۔ نوکروں، افسروں اور ماتحتوں کے درمیان کسی قسم کی آزردگی اور ناخوشگواری کو

موقع نہ ملے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹے اپنے بڑوں کا ادب کریں اور بڑے اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آئیں۔ اگر بڑوں کی کوئی حرکت ایسی ہو جس کو چھوٹا زیادتی تصور کرتا ہے تو وہ ادب و لحاظ کی بنیاد پر اس سے متاثر نہ ہو اور اگر چھوٹے سے کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو جائے تو بڑے شفقت و محبت سے پیش آئیں تاکہ خورد و کلاں کے درمیان توازن قائم رہے اور نا اتفاقی و ناگواری کے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔

حرص و طمع

حضور نبی کریم علیہ السلام فرماتے ہیں۔ جب تم سے کوئی شخص اپنے سے زیادہ امیر کو دیکھے تو اسکو چاہیئے کہ فلینظر الی عن ھو اسفل عنہ (بخاری) پھر وہ اپنے سے غریب کی طرف کی خیال کرے۔

حدیث مذکور پر غور کرنے سے قبل یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ امیری اور غریبی فطری اوصاف ہیں اور امیری و غریبی کے امتیاز کو مٹانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں اور بعض وہ ہیں جنہیں زمین کا ایک گز ٹکڑا بھی میسر نہیں ہوتا۔ ایک غریب جب اپنے سے خوشحال اور امیر کو دیکھتا ہے تو فطری طور پر اس کے دل میں حسد، طمع اور حرص کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں اور یہ حرص ایسا ناپاک جذبہ ہے جو تمام برائیوں اور خرابیوں کی جڑ ہے۔ حرص ہی ایک دوسرے کی جان لینے اور مال چھیننے پر آمادہ کرتی ہے اور طمع ہی ظلم و ستم کی بنیاد قرار پاتی ہے۔

چنانچہ معاشرہ میں حرص اور طمع ایسے ناپاک جذبہ کو ختم کرنے کے لئے حضور نبی کریم علیہ السلام نے یہ ہدایت فرمائی کہ جب تم اپنے سے خوشحال شخص کو دیکھو تو اس کے ساتھ اپنے سے غریب کے حال پر بھی نظر ڈال لیا کرو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ امیر کو دیکھ کر حرص و طمع کا جو جذبہ تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے وہ اپنے سے غریب کو دیکھ کر ختم ہو جائے گا۔ اور اس طرح معاشرہ میں توازن قائم رہے گا۔ اور برائیوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے گا۔

منافق کی علامت

حضور روحی فداہ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔

آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اذا حدَّثَ	منافق کی تین علامتیں ہیں۔ بولے تو جھوٹ۔
کَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ اخلَفَ واذا	وعدہ کرے تو خلاف۔ امین بنایا جائے تو
ائتُمِنَ خَانَ (بخاری)	خیانت کرے۔

حدیث بالا میں تین باتوں کو منافقت کی علامت قرار دیا گیا ہے یعنی اگر فی نفسہٖ وہ شخص منافق نہ بھی ہو تو پھر بھی ان تین بدعادتوں کا اس میں پایا جانا منافقت کا پیش خیمہ ہوگا۔ (اوّل) جب بات کرے جھوٹ بولے

اور جھوٹ کو اپنی طبیعت ثانیہ بنالے (دوم) جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے (سوم) اگر اس کے سپرد امانت کی جاوے تو خیانت کے بدترین جرم کا ارتکاب کرے۔

حدیث مذکورہ کی تفسیر کے لئے تو دفتر درکار ہے مگر قابل غور بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے اپنے نفس کا احتساب کرے اور پورے خلوص کے ساتھ یہ دیکھے کہ ہم میں یہ اوصاف موجود ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ہمارے دل میں ان کے ترک کا خیال بھی ہوا ہے؟

اخلاق

حضور نبی کریم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:-

اَحَبُّ عباد اللہ الی اللہ احسنھم
اخلاقاً۔ (طبرانی)

بندوں میں اللہ کو وہ بندہ بہت پیارا ہے جس
کے اخلاق اچھے ہوں۔

اگرچہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہے مگر اسلام کا فلسفہ سب سے بلند ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ دنیا کے تمام بانیانِ مذاہب نے اخلاق حسنہ کی تعلیم دی ہے لیکن خود ان بانیوں اور واعظوں کی ذاتی زندگی اور ان کا اپنا کردار پردۂ اخفا ہی میں رہا ہے۔ اس کے برعکس معلم کائنات حضور نبی کریم علیہ السلام کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی زندگی پاک کا ہر گوشہ دنیا کے سامنے ہے اور اخلاقِ نبوت کا ہر پہلو آفتاب و مہتاب کی طرح نمایاں و درخشاں ہے اور ہر شخص حضور نبی کریم علیہ السلام کی سیرت پاک کا مطالعہ کر کے اسلام کے فلسفہ اخلاق پر کاربند ہو سکتا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضور کا اخلاق کیا ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ قرآن کا مطالعہ کرو وہ الفاظ ہیں اور نبی کریم کی زندگی اس کی عملی تفسیر ہے۔

اخلاق انسانوں کے باہمی تعلقات میں اچھائی۔ نیک نیتی۔ خلوص۔ دیانت اور نرمی برتنے کا نام ہے یعنی جو فرائض انسانی ایک دوسرے پر عاید ہوئے ان کو کما حقہٗ ادا کرنا۔ حدیث بالا میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے فرائض کما حقہٗ ادا کرنے چاہئیں اور فرائض کی ادائیگی میں خلوص اور نرمی سے کام لینا چاہیئے۔ شک نہیں کہ جس انسان میں ایسا اچھا اخلاق پیدا ہو جائے وہ اپنے فرض کو سمجھے اور اس کو حکمت و موعظت کے ساتھ ادا کرے وہ کیوں نہ اللہ کا محبوب بن جائے۔

ایمان اور کُفر کا بیان

اِسلام کی ہمہ گیری دنیا کے مذاہب ہیں وہ کاملیت نہیں جو اسلام میں ہے۔ دیگر مذاہب دین و دنیا کے کسی ایک شعبہ پر زور دیتے ہیں اور دوسرے شعبہ کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دنیا کے مذاہب کو اپنے دینی یا دُنیوی مسائل کی تکمیل کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کو اپنانے اور اس سے ہدایت لینے کی ضرورت پڑتی ہے مگر دینِ اسلام ایک کامل قانون اور مکمل شریعت ہے، اور اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ یہ حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاحِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کی تکمیل اپنے ارشاد اور عمل سے نہ کر دی ہو۔ اسلام میں حضور علیہ السلام کے سوا اور کچھ نہیں ہے عبادات ہوں یا اخلاق، انسان کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ۔ ان سب کا ماخذ و مرکز ذاتِ نبوی ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ بیشک تمہیں۔ رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے

۱۔ خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ ہے اس کا تعلّق صرف دل سے ہے تو اس کا نام عقیدہ اور ایمان ہے

۲۔ اور اگر قلبی حالات کے ساتھ جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔

۳۔ باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو تعلّق ہے اور اس حیثیت سے جو احکام ہم پر عاید ہوتے ہیں اگر ان کی حیثیت قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے۔

۴۔ اور اگر قانون کی حیثیت نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے،

غرضیکہ دینِ اسلام عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق انہیں چاروں کا مجموعہ ہے، اور ان میں ایمان اور عقیدہ تمام اعمال و افعال کی اصل ہے اور یہ ہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خطّہ نکلتا ہے۔

عقیدہ کی اہمیت اور ضرورت یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عقیدہ وخیال کے بغیر حیاتِ انسانی کی بقا ناممکن ہے۔ عقیدہ کے عام معنی غیر متزلزل اور پختہ اصولی خیالات کے ہیں یہ ہی اصولی خیالات انسان کے ارادہ اور عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ خیال کے بغیر ارادہ اور عمل کا ظہور ناممکن ہے۔ ایک معمار مکان بناتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں ایک خیال ہوتا ہے۔ وہ خیال اس کو ارادہ پر مجبور کرتا ہے اور ارادہ عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عمل اور ارادے کا دارومدار خیال اور عقیدہ پر ہے۔ جسم انسانی میں دل ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام اقلیمِ بدن پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ ہی گوشت کا وہ ٹکڑا ہے جس کو عقیدہ یا خیال یا ضمیر سے موسوم کرتے ہیں۔ معلمِ کائنات نے بھی دل ہی کو تمام اعضاء انسانی میں نیکی وبدی کا مرکز قرار دیا ہے۔

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے
صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا	جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے
فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا	اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں
هِیَ الْقَلْبُ	وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآنِ حکیم نے دل کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں (۱) قلبِ سلیم۔ جو ہر گناہ سے پاک رہ کر نجات کے راستہ پر چلتا ہے (۲) قلبِ اثیم: یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ (۳) قلبِ منیب۔ رجوع ہونے والا دل جو اگر کبھی بھٹکتا ہے تو فوراً نیکی کی طرف پلٹ آتا ہے۔

غرضیکہ انسانی مشینری کا ہر پرزہ اسی دل کے ارادہ اور نیت کی طاقت سے چلتا ہے۔ اسی لئے حضورِ اکرم علیہ السّلام نے فرمایا:۔ ”تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے“

علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے عمل وارادہ پر کوئی چیز حکمران ہے، تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ انسان کی عملی اصلاح کیلئے اس کی قلبی ودماغی اصلاح مقدم ہے لہٰذا صحیح اور

صالح عمل کیلئے ضروری ہے کہ چند اصول اس طرح مان لئے جائیں کہ وہ دل کا غیر متزلزل اور غیر مشکوک عقیدہ بن جائیں اور اسی عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

عقیدہ اعمال کی اساس ہے قرآن پاک نے ایمان کا ذکر عمل کے ذکر سے لازمی طور پر پہلے کیا ہے۔ اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں قرار دیا کیونکہ ایمان و عقیدہ کے عدم سے اس مخلصانہ ارادہ کا عدم ہوجاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا مدار ہے۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن جدعان کے متعلق پوچھا جس نے جاہلیت کے زمانہ میں نیکی کے کام کئے تھے کیا اس کو ثواب ملیگا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا نہیں کیونکہ اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ الٰہی میرے گناہوں کو قیامت کے دن بخش دے یعنی اس نے عمل تو نیک کئے مگر عمل کا جس عقیدہ پر مدار تھا وہ اس میں نہ پایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عقیدہ عمل کی اساس ہے اور عقیدہ کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔

ایمان کے بغیر عمل بے کار ہے قرآن حکیم نے ایمان کو تمام اعمال کی اساس قرار دیا ہے اور ایمان سے محروم افراد کے کاموں کی مثال راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

(۱)	مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۔	جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثل اس راکھ کی سی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔ وہ اپنے کئے میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔
(۲)	وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (نور)	جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے حتّٰی کہ جب وہ اسکے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

یہ اور اسی مضمون کی متعدد آیات ہیں جن میں اس امر کی تصریح ہے کہ ایمان کے بغیر عمل بیکار ہے اور ایمان سے محروم افراد خواہ کتنے ہی نیک عمل کریں وہ سراب اور راکھ کی طرح ہیں جیسے سراب سے پیاسا پانی نہیں پاتا راکھ کے ڈھیر میں کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی طرح بے ایمان کے اعمال کا حال ہے۔

ایمان اور کُفر کی تعریف خدا کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور خدا کی اطاعت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں اس کی پسند و ناپسند کا علم ہو ہم اپنے کسی عزیز یا دوست کی پسند و ناپسند کو اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک کہ وہ خود اپنے کلام سے یا طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ کر دے تو جب عقلِ انسانی اپنے ہم جنس کی پسند و ناپسند کے ادراک سے قاصر ہے تو اس ہستی مقدس کی پسند و ناپسند کو صرف عقل کیسے جان سکتی ہے جس کا ادراک ہی سرحد عقل سے باہر ہے۔ دنیا میں انبیائے کرام کے بھیجنے کی حکمت ہی یہی ہے کہ انسان ان کے ذریعہ اللہ کی پسند و ناپسند سے واقف ہو جائے۔

پس اس دنیا میں خدا کے ماننے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ اسکے رسول کی لائی ہوئی ہدایات کو دل و زبان سے تسلیم کیا جائے کیونکہ رسول خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ انہی کے ذریعے مخلوق کی ہدایت فرماتا ہے اور انہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہدایات کے قبول کرنے کا نام اسلام ہے اور ان کی ہدایات کو نہ قبول کرنے کا نام کفر ہے۔

مذہب کا بنیادی مسئلہ کفر و ایمان ہے اسی لئے قرآن کی سب سے پہلی سورۃ (بقرہ) میں اسکو بیان کیا گیا اور پورے عالم کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ مومن، کافر، منافق۔ سورۃ بقر کی ابتدائی پانچ آیتوں میں مومنین کی شان کا بیان ہے اور بعد کی دو آیتیں کفار کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد تیرہ آیتیں منافقین کے حال میں ہیں۔ اگرچہ کافر و منافق اصل میں ایک ہی گروہ ہے لیکن چونکہ منافق کی ظاہری صورت عام کفّار سے مختلف ہوتی ہے اور منافقین کا گروہ بہ نسبت کھلے ہوئے

کافروں کے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے ان کے حالات کا بیان تیرہ آیتوں میں اور زیادہ تفصیل سے کیا گیا۔

(۱) الٓمّٓ سے مُفْلِحُوْنَ تک پانچ آیتوں میں مومن اور ایمان کا اجمالی ذکر ہے الذین یومنون بالغیب یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ غیب سے اس جگہ وہ تمام اعتقادات مراد ہیں جو انسان کی نظر اور مشاہدہ سے پوشیدہ ہیں جیسے قیامت، جنت، دوزخ، پل صراط، میزان وغیرہ (خازن و ابن کثیر)

اس ایمانِ اجمالی کی تفصیل بعد کی تیسری آیت میں کر دی۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ	جو حضور پر نازل شدہ کتاب اور شریعت پر ایمان
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ	لائے اور گذشتہ انبیاء پر نازل شدہ وحی اور شریعت
هُمْ یُوْقِنُوْنَ	پر بھی اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

یہاں ایمان کے سب سے پہلے جزء ایمان باللہ کا صراحۃً ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ اللہ ہی پر ایمان نہ ہوگا تو اسکے رسولوں اور وحی پر ایمان کیونکر ہو سکے گا۔ اسی سورۃ کے ختم پر جب مکرر ایمان کے مفہوم کی تشریح فرمائی گئی، تو وہاں "ایمان باللہ" کو صریح لفظوں میں ذکر کیا گیا "کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ ۔۔۔۔ الخ" چنانچہ ایمان مجمل و مفصّل جو مشہور ہیں اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ ایمان مجمل سورۂ بقر کی پہلی آیات سے اور ایمان مفصل اس کی آخری آیات سے اخذ کیا گیا۔

پس آیت مذکورہ سے ایمان کے تین بنیادی اصول معلوم ہوئے۔ اللہ پر ایمان لانا۔ رسول اللہ اور انبیاء سابقین اور ان سب کی وحیوں پر ایمان لانا۔ آخرت پر ایمان لانا۔ یہ ہی تین چیزیں دراصل ایمان کے اصول ہیں باقی سب فروع ہیں۔ امام غزالیؒ نے فیصل التفرقہ فی الاسلام و الزندقہ میں لکھا۔

اُصُوْلُ الْاِیْمَانِ ثَلٰثَۃٌ اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ	ایمان کے اصول تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ اسکے رسول پر

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا عَدَاہُ فُرُوْعٌ ایمان اور قیامت پر ایمان اس کے سوا سب فروع ہے۔

اور ان اصولوں کو بھی مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "ایمان بالرسول" میں سب اصول آجاتے ہیں کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ ہو رسول پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا اور رسول پر ایمان ہو جائے تو یوم قیامت پر ایمان خود اس کے اندر داخل ہے۔ کیونکہ "ایمان بالرسول" کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی تمام ہدایتوں پر ایمان لایا جائے۔ اسی لئے ائمۂ اسلام نے ایمان کی تعریف یوں فرمائی۔

هُوَ التَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ایمان ان امور کی تصدیق کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے
تَعَالٰی اَیْ تَصْدِیْقَ النَّبِیِّ بِالْقَلْبِ فِیْ جَمِیْعِ آئے یعنی اجمالی طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل
مَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِیْئُهٗ بِهٖ من عِنْدِ اللّٰهِ سے تصدیق کرنا ہر اس چیز میں جو آپ اللہ کی طرف سے
اِجْمَاعاً لائے جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہو۔

ثبوتِ قطعی ضروری و بالضّرورۃ وضروریاتِ دین کی تعریف

(۱) **ثبوتِ قطعی**: یعنی وہ امور جو حضور علیہ السلام سے ہم تک بطریقِ تواتر پہنچے اس کا ثبوت قطعی ہے جیسے تعدادِ رکعات، زکوٰۃ کی مقدار، قرآنِ حکیم وغیرہ۔ تواتر کے معنی یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام سے لیکر ہم تک ہر قرن اور ہر زمانہ میں دُنیا کے مُختلف خطوں میں اس بات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کرنے والے اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا غلطی یا کذب پر مُتّفق ہوجانا عقلاً محال ہو۔

(۲) **ضروری و بالضّرورۃ**: عرب فُقہا و مُتکلّمین میں ضروری و بالضّرورۃ کا مطلب یہ ہے کہ تواتر کے ساتھ ساتھ اس بات کی شہرت تمام خاص و عام مسلمانوں میں اس درجہ کی ہوجائے کہ عوام تک اس سے واقف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، نبوّت کا حضور علیہ السّلام پر ختم ہونا وغیرہ۔

(۳) **ضروریات**: جو امور حضور علیہ السلام سے بذریعہ تواتر اس درجہ شہرت و بداہت کے ساتھ ثابت ہوں کہ ہر خاص و عام اس سے باخبر ہو ان کو فقہا و مُتکلّمین کی اصطلاح میں ضروریاتِ دین سے موسوم کیا جاتا ہے۔

هُوَ مَا يَعْرِفُ الْخَوَاصُّ وَالْعَوَامُّ اَنَّهُ مِنَ الدِّيْنِ لِوُجُوْبِ الْاِعْتِقَادِ التَّوْحِيْدِ وَالرِّسَالَةِ وَالصَّلٰوٰتِ الْخَمْسِ وَاَخَوَاتِهَا يُكَفَّرُ مُنْكِرُهٗ (ردالمحتار ص۲۶۳ جلد ۱)

ضروریاتِ دین وہ امور ہیں جن کو ان کی شہرت کی وجہ سے، خواص و عوام سب ہی دین کی ضروری باتیں سمجھتے ہیں جیسے توحید، رسالت، پانچ نمازیں اور اسی کے مثل اور باتیں جن کا منکر کافر ہوتا ہے۔

(۴) علامہ شہاب الدین ابن حجر اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں۔

(۱) ثُمَّ الْمَعْلُوْمُ بِالضَّرُوْرَةِ مِنَ الشَّرْعِ قِسْمَانِ اَحَدُهُمَا مِمَّا يَعْرِفُهُ الْخَاصَّةُ وَالثَّانِيْ مَا قَدْ يَخْفٰى عَلٰى بَعْضِ الْعَوَامِ وَلَا يُنَافِيْ فِيْ هٰذَا قَوْلُنَا اِنَّهٗ مَعْلُوْمٌ بِالضَّرُوْرَةِ لِاَنَّ الْمُرَادَ مَنْ مَارَسَ الشَّرِيْعَةِ عِلْمٌ مِنْهَا مَا يَحْصُلُ بِهِ الْعِلْمُ الضَّرُوْرِيُّ بِذَالِكَ وَهٰذَا يَحْصُلُ لِبَعْضِ النَّاسِ دُوْنَ بَعْضٍ بِحَسَبِ الْمُمَارَسَةِ وَكَثْرَتِهَا اَوْ قِلَّتِهَا اَوْ عَدَمِهَا فَالْقِسْمُ الْاَوَّلُ مَنْ اَنْكَرَهٗ مِنَ الْعَوَامِ وَالْخَوَاصِ فَقَدْ كَفَرَ لِاَنَّهٗ كَالْمُكَذِّبِ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَبَرِهٖ۔

پھر ضروریات دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسے ہر خاص و عام جانتا ہو (عام جو کہ مُخالط للخواص ہو) اور دوسری قسم وہ ہے جو کبھی بعض عوام پر مخفی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود اسے معلوم بالضرورۃ کہا جائے گا۔ کیونکہ معلوم بالضرورۃ سے وہ مسائل مراد ہیں جن کا ماہرین شریعت کو علم ضروری حاصل ہُوا دریہ قلّت و کثرت مہارت کی وجہ سے بعض کو معلوم ہوتا ہے اور بعض اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ قسم اول کا انکار عوام و خواص میں سے جو شخص بھی کرے وہ کافر قرار پائے گا۔ اس لئے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر میں حضور کی تکذیب کرتا ہے۔

(۲) وَالْقِسْمُ الثَّانِيْ مَنْ اَنْكَرَهٗ مِنَ الْعَوَامِ الَّذِيْنَ لَمْ يَحْصُلْ عِنْدَهُمْ مِنْ مُمَارَسَةِ الشَّرْعِ مَا يَحْصُلُ بِهِ الْعِلْمُ الضَّرُوْرِيُّ لَمْ

اور قسم ثانی کا انکار اگر عوام میں سے وہ لوگ کریں جنہیں شریعت میں ممارستہ تامہ حاصل نہیں جس کی وجہ سے انہیں علم ضروری حاصل ہوجائے تو وہ کافر نہیں ہونگے

يُكْفَرُ وَإِنْ كَانَتْ كَثْرَةُ الْمُمَارَسَةِ تُوجِبُ لِلْعُلَمَاءِ الْعِلْمَ الضَّرُوْرِيَّ ۔ (فتاوی حدیثیہ ص۱ ۱۲)

اگرچہ کثرتِ مہارت علماء کے لئے اس کے علم ضروری کو واجب کرتی ہو۔

(۳) اِلَّا اِذَا ذُكِرَ لَهٗ اَهْلُ الْعِلْمِ اَنَّهٗ مِنَ الدِّيْنِ وَاَنَّهٗ قَطْعِيٌّ فَتَمَادٰى فِيمَا هُوَ عَلَيْهِ عِنَادًا فَيُكْفَرُ بِظُهُوْدِ التَّكْذِيْبِ مِنْهُ حِيْنَئِذٍ فتاوی حدیثیہ ص۴ ۱۲

لیکن جب اہل علم (قسم ثانی کے) منکر کو یہ بتا دیں کہ یہ مسئلہ دین سے ہے اور قطعی ہے اس کے باوجود وہ منکر اپنی بات پر عناداً اڑا رہے تو اب اسکی بھی تکفیر کی جائیگی کیونکہ (معلوم ہو جانیکے بعد انکار سے حضور علیہ السلام کی تکذیب کا ظہور ہو گیا

ان عبارات سے واضح ہوا کہ ضروریاتِ دین کی دو قسمیں ہیں۔ اول تو وہ ہے جس کا دینی ضروری ہونا خواص کو معلوم ہوتا ہے اور ان عوام کو بھی معلوم ہوتا ہے جو علماء سے ربط و ضبط رکھتے ہیں تو قسم اول کا انکار خواہ عوام کریں یا خواص بہر حال یہ کفر قطعی ہے اور دوسری قسم وہ ہے کہ جس کا ضروری دینی ہونا بعض عوام پر مخفی ہوتا ہے تو اگر عوام میں سے کوئی انکار کر دے تو اسے کافر قرار نہیں دیں گے۔ لیکن جب کہ علماء اسکو بتا دیں کہ یہ مسئلہ بھی ضروری و قطعی ہے اور اس پر بھی وہ ازراہ عناد انکار پر اڑا رہے تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی۔

الغرض ضروریاتِ دین اصطلاحِ شریعت میں انہی امور کو کہا جاتا ہے جو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ تواتر ثابت ہوں اور عام طور پر مسلمان ان امور کو جانتے ہوں۔ اسلام و ایمان کیلئے ان امور کا تسلیم کرنا لازم و ضروری ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔

فائدہ ضروریاتِ دین پر ایمان کے لئے ان کی پوری تفصیل کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔ نفس ایمان کیلئے اجمالی تصدیق بھی کافی ہے ایمان اجمالی کے لفظ یہ ہیں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ

میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات و صفات میں ہے ایمان لایا اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کئے

اس کلمہ میں خدا پر جیسا کہ وہ اپنی ذات و صفات میں ہے ایمان لانے کا مجمل طور پر اقرار ہے۔

مگر یہ اجمال ایسا ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق دین سے جو بھی تفصیل معلوم ہوگی اس پر ایمان لانے کا اعتراف بھی ہے۔ اسی طرح یہ جملہ کہ "اس کے تمام احکام قبول کرتا ہوں" یہ بھی مجمل ہے مگر بایں طور کہ ہر حکم جس کا حکم الٰہی ہونا ثابت ہوگا اس پر ایمان لانے کا بھی اقرار ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ ایمان مجمل میں ایمان مفصل بہرحال داخل ہوتا ہے اور ایمان مفصل کے الفاظ یہ ہیں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ	اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ	کے رسولوں پر، آخرت پر، نیکی و بدی اللہ کی طرف
مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ط	سے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لاتا ہوں۔

الغرض نجات کے لئے مجمل طور پر ایمانیات کو قبول کرلینا کافی ہے۔

واضح ہو کہ امور ایمانیہ کی جو تشریح و تفصیل کتاب و سنّت نے کردی ہے اس کو بعینہٖ تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان کا اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم و معنیٰ متعیّن کرنا یا کسی قسم کی ترمیم کرنا گمراہی و بے دینی ہے

(٢) ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق کا نام ہے تو کفر میں تمام ایمانیات کا انکار و تکذیب ضروری نہیں بلکہ ان میں سے کسی ایک چیز کی تکذیب و انکار بھی کفر ہے خواہ باقی تمام امورِ ایمانیہ کو صدق دل سے قبول کیا جائے۔ اس تفصیلی گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ

ایمان : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو کہتے ہیں ہر اس چیز میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی و بدیہی طور پر ہوچکا ہو۔

مومن : وہ شخص ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرے ہر اس امر میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہوا ہے۔

اسلام : اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار بشرطیکہ اس کے ساتھ ایمان تصدیق قلبی موجود ہو

مسلمان : وہ شخص ہے جو اللہ و رسول کی اطاعت کا اقرار کرے بشرطیکہ اس کے ساتھ تصدیق قلبی بھی ہو۔

کفر : جن امور کی تصدیق ایمان میں ضروری ہے ان میں سے کسی امر کی تکذیب و انکار کفر ہے۔

کافر : وہ شخص ہے جو ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا دل سے انکار یا زبان سے تکذیب کر دے۔

اسلام، ایمان، مسلم و مومن میں فرق

لغۃً ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے اور اسلام کا محل قلب اور سب اعضا و جوارح ہیں لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں یعنی اللہ و رسول کی محض دل سے تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک اس کے ساتھ دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو غرضکہ از روئے لغت ایمان و اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بنا پر ایمان و اسلام کے اختلاف کا ذکر ہے لیکن خود قرآن و حدیث ہی کی تصریحات کے مطابق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً کوئی ایمان بدون اسلام کے یا اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔ اسی مضمون کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی ساخت تو ایک ہے۔ فرق مبدا، اور منتہیٰ کا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر پر منتہیٰ ہوتا ہے اور اسلام ظاہر سے شروع ہو کر قلب پر منتہیٰ ہوتا ہے، اگر قلبی تصدیق ظاہری اقرار تک نہ پہنچے تو وہ تصدیقِ ایمان معتبر نہیں، اسی طرح ظاہری اقرار و اطاعت اگر تصدیقِ قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔ چنانچہ قرآن نے کہا :۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اللہ کا دین اسلام ہے اور ہر وہ چیز جو اسلام نہ ہو وہ غیر مقبول ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان بھی دین ہی تو ہے تو اگر ایمان، اسلام کا غیر ہوتا تو وہ مقبول نہ ہوتا لہٰذا اسلام اور ایمان کا ایک ہونا ثابت ہوا۔ شرح عقائد نسفی میں ہے۔

اَلْاِسْلَامُ وَالْاِیْمَانُ وَاحِدٌ　　　اسلام و ایمان شے واحد ہیں۔

علامہ شیخ کمال الدین ہمام شارح ہدایہ نے شرح مسامرہ میں فرمایا :۔

وَقَدْ اِتَّفَقَ اَهْلُ الْحَقِّ وَهُوَ فَرِيْقَانِ الْاَشَاعِرَةُ وَالْحَنَفِيَّةُ عَلٰى تَلَازُمِ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ بِمَعْنٰى اَنَّهٗ اَلْاِيْمَانَ لَايُعْتَبَرُ بِلَا اِسْلَامٍ وَعَكْسُهٗ

اہل حق نے اتفاق کیا اور وہ دونوں گروہ اشاعرہ وحنفیہ ہیں کہ ایمان و اسلام باہم متلازم ہیں۔ بایں معنی کہ اسلام بغیر ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے معتبر نہیں۔

یعنی یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ایک شبہ کا ازالہ اگر اس موقع پر یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ قرآن پاک میں ہے : قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام بغیر ایمان کے بھی پایا جاتا ہے جبھی تو قرآن حکیم نے اسلام کا اثبات اور ایمان کی نفی کر دی۔

جواب یہ ہے کہ آیت میں جس اسلام کا ذکر ہے وہ وہ ہے جس میں تصدیقِ قلبی نہ ہو جیسے جو شخص زبان سے کلمہ پڑھے اور دل میں تصدیق نہ ہو تو اس کا ایمان معتبر نہیں۔ تو آیت میں اعراب کے نفاق کا بیان ہے کہ تم لوگ ظاہری طور پر اعانت کر رہے ہو مگر تمہارے دل میں تصدیق نہیں ہے! اور شرعاً وہ اسلام معتبر ہے جس میں تصدیقِ قلبی بھی ہو۔ لہذا آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ اسلام بغیر ایمان کے پایا جاتا ہے بلکہ اعراب کی منافقت کا بیان ہے اگر کہا جائے کہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اعمال کا نام ہے تصدیقِ قلبی کا نہیں جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ تو کلمہ کی شہادت دے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے۔ جواب یہ ہے کہ حدیث ہذا میں اسلام کے ثمرات و علامات کا بیان ہے یعنی ایمان و اسلام کی علامت یہ ہے کہ انسان فرائض اسلامیہ کی تعمیل کرے جیسا کہ دوسری حدیث میں فرمایا۔ تم جانتے ہو ایمان کیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت دے۔ نماز، روزہ،

حج، زکوٰۃ کو ادا کرے، یہاں ایمان کی تعریف میں عمل کو صرف اس لئے داخل کیا تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ اعمال صالحہ ایمان و اسلام کی علامتیں اور اس کے ثمرات ہیں تو اسی طرح مذکورہ بالا حدیث میں اسلام کے ثمرات وعلامات کا بیان ہے۔

کفر کی تعریف اور اس کے اقسام کفر شریعت میں ایمان کی ضد ہے یعنی ایسے احکامِ شرعیہ جو ہم کو قطعی اور یقینی طور پر حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہنچے ہیں انہیں نہ ماننا کفر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ کفر تکذیبِ رسول کا نام ہے پھر تکذیب کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) صراحتاً حضور علیہ السّلام کو اللہ کا رسول ہی تسلیم نہ کرنا جیسے ہندو، سکھ، وعیسائی تسلیم نہیں کرتے۔

(۲) رسول تسلیم کرنے کے باوجود آپ کے کسی قول کو صراحتہً غلط یا جھوٹ قرار دینا یعنی آپ کی بعض ہدایات کو ماننا اور بعض کی تکذیب کرنا۔

(۳) یہ کہ کسی قطعی الثّبوت قول یا فعلِ رسول کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ یہ حضور علیہ السّلام کا قول یا فعل نہیں ہے۔

(۴) یہ کہ قول و فعلِ رسول کریم کو تسلیم کرتے ہوئے قرآن وحدیث میں ایسی تاویلات باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقائد کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہو جائے ایسی تاویل بھی تکذیبِ رسول (علیہ السّلام) ہی کے حکم میں ہے۔

کفر و ارتداد کا معیار کیا ہے؟ واضح ہو کہ کفر و ارتداد اس صورت میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکمِ قطعی سے انکار کر دے مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں ہے جنّت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یا کوئی شخص پانچ وقت کی نماز کا تو شدّت سے پابند ہے مگر فرض و واجب نہیں مانتا تو یہ بھی کفر ہے اور دوسرا شخص جو غفلت کی وجہ سے نماز تو نہیں پڑھتا مگر نماز کی فرضیت کا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہے اگرچہ فاسق و فاجر اور سخت گنہگار ہے۔

دوم یہ کہ ثبوت کے اعتبار سے احکامِ اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہیں، تمام اقسام کا حکم ایک نہیں ہے کفر و ارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثّبوت اور قطعی الدّلالت بھی ہوں۔

قطعی الثبوت کے معنی

قطعی الثبوت ہونیکا مطلب یہ ہے، کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جنکے روایت کرنے والے حضور علیہ السلام سے لیکر آجتک ہر زمانہ ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے، اسی کو اصطلاحِ حدیث میں تواتر اور ایسی حدیث کو حدیثِ متواترہ کہتے ہیں۔

قطعی الدلالت کے معنی

قطعی الدلالت ہونیکا یہ مطلب ہے، کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے یا حدیث متواترہ سے ثابت ہوئی ہے وہ اپنے مفہومِ مراد کو صاف صاف ظاہر کرتی ہو کہ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ اور ابہام نہ ہو۔

پھر اس قسم کے احکامِ قطعیہ اگر عوام[1] و خواص میں مشہور و معروف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، جوا، شراب اور زنا کا گناہ ہونا، حضور علیہ السلام کا خاتم الانبیا ہونا وغیرہ تو ایسے احکامِ قطعیہ کو ضروریاتِ دین سے موسوم کرتے ہیں اور جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں۔

ضروریاتِ دین اور قطعیات کے حکم میں کیا فرق ہے؟

ضروریاتِ دین اور قطعیات کے حکم میں فرق یہ ہے کہ ضروریاتِ دین کا انکار باجماعِ امت مطلقاً کفر ہے۔ ناواقفیت وجہالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی تاویل سنی جائے گی۔

اور قطعیاتِ محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہ پہنچیں تو حنفیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی آدمی بوجہ ناواقفیت وجہالت کے انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر و ارتداد کا حکم نہ کیا جائے گا بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائے گی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام سے ہے۔ اس کا انکار کفر ہے

---

[1] عوام سے مراد علماء کی صحبت میں رہنے والے عوام مراد ہیں، چنانچہ فتاویٰ حدیثیہ میں ہے۔

وَهُوَ اَنْ يَّكُوْنَ قَطْعِيًّا مَشْهُوْرًا بِحَيْثُ لَا يَخْفٰى عَلَى الْعَامَّةِ الْمُخَالِطِيْنَ لِلْعُلَمَاءِ بِاَنْ يَّعْرِفُوْهُ بِدَاهَةً مِّنْ غَيْرِ افْتِقَارٍ اِلٰى نَظْرٍ وَّاسْتِدْلَالٍ

وہ قطعی ایسا مشہور ہو کہ علماء سے اختلاط رکھنے والے عوام پر مخفی نہ ہو بایں طور کہ نظر و استدلال کی طرف احتیاج کے بغیر وہ اسے بداہۃً جانتے ہوں۔

اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب حکمِ کفر کر دیا جائے گا۔ علامہ ابن الہمام نے لکھا۔

وَاَمَّا مَا ثَبَتَ قَطْعًا وَلَمْ يَبْلُغْ حَدَّ الضُّرُوْرَةِ كَاسْتِحْقَاقِ بِنْتِ الْاِبْنِ السُّدُسَ مَعَ الْبِنْتِ الصُّلْبِيَّةِ بِاِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ فَظَاهِرُ كَلَامِ الْحَنَفِيَّةِ الْاِكْفَارُ بِجَحْدِهٖ بِاَنَّهُمْ لَمْ يَشْتَرِطُوْا فِي الْاِكْفَارِ سِوَى الْقَطْعِ فِي الثُّبُوْتِ (اِلٰى قَوْلِهٖ) وَيَجِبُ حَمْلُهٗ عَلٰى مَا اِذَا عَلِمَ الْمُنْكِرُ ثُبُوْتَهٗ قَطْعًا

(مسامرہ ص۱۳۹ شامی ج۳ ص۳۰۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو جیسے (میراث میں) اگر پوتی اور حقیقی بیٹی جمع ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماعِ امت سے ثابت ہے تو ظاہر کلامِ حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جائے کیونکہ انہوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الیٰ قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کفر و ارتداد کی ایک قسم تو تبدیلِ مذہب ہے، اسی طرح دوسری قسم یہ ہے کہ ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریاتِ دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے ان کے معروف فی الشرع معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور غرضِ معروف بدل جائے۔

بنا بریں اگر کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف ہوں تو اس شخص کے کفر میں کوئی تامل نہیں کیا جائے گا۔

ضروریاتِ دین میں تاویل مسموع نہیں ہے

واضح ہو کہ تاویل وہاں معتبر ہے جہاں کوئی اشتباہ ہو اور قواعدِ عربیت و قواعدِ شریعت میں اس کی واقعی گنجائش ہو یعنی وہ تاویل کتاب و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف نہ ہو اور جو حکم شرعی ایسی دلیل سے ثابت ہو جو کہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہو اس میں تاویل معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے امور میں تاویل کفر ہے۔ مثلاً کوئی عین نصف النہار کے وقت جب کہ ابر و غبار بھی نہ ہو اور دھوپ نکل رہی ہو یہ کہے اس وقت دن نہیں بلکہ رات ہے کیونکہ ممکن ہے کہ آسمان پر کوئی بجلی کوند رہی ہو اور یہ روشنی اسی کی ہو جسے لوگ دھوپ سمجھ رہے ہیں تو کیا کوئی عاقل اس تاویل کو تاویل کہے گا ؟ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ محسوس اور

مشاہدہ کا انکار کر رہا ہے لہٰذا ضروریاتِ دین میں ایسی تاویل معتبر نہیں ہوگی کیونکہ اگر اس طرح کی تاویلیں معتبر مان لی جائیں تو پھر دنیا میں کوئی کافر نہ رہے گا، منکرینِ توحید و رسالت اور دہریہ تک کافر نہ ہوں گے۔ آخر وہ بھی تو کسی دلیل اور تاویل ہی کی وجہ سے توحید و رسالت کے منکر ہیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحکیم خیالی میں لکھتے ہیں۔

وَالتَّاوِیْلُ فِی الضَّرُوْرِیَاتِ الدِّیْنِ لَا ضروریاتِ دین میں تاویل کرنا کفر سے نہیں
یَدْفَعُ الْکُفْرَ حاشیہ ص۱۲۶ بچا سکتا۔

شیخ نے فتوحات میں فرمایا۔

اَلتَّاوِیْلُ الْفَاسِدُ کَالْکُفْرِ ج۲ ص۸۵ تاویلِ فاسد مثل کفر کے ہی ہے۔

حضرت امام غزالیؒ نے "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور ائمہ دین فقہا و متکلّمین نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

قرآن و حدیث میں ایسی تاویلاتِ باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقیدہ کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہو جائے تو ایسی تاویل بھی تکذیبِ رسول ہی کے حکم میں ہے اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔

تفصیل کیلئے اہلِ علم حسبِ ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں۔

التفرقہ۔ مسوّیٰ ج ۲ ص۱۳ جوہر التوحید۔ ردالمحتار ج ۳ ص۲۹۶ شفاء ص۱۲۱ ایثار الحق علی الخلق ص۴۲۱

کفر کیلئے تمام امورِ ایمانیہ کا انکار ضروری نہیں ہے

واضح ہو کہ ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق و تسلیم کا نام ہے لیکن کفر میں ان سب چیزوں کی تکذیب یا انکار ضروری نہیں ہے بلکہ ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر ہے مثلاً تمام امورِ ایمانیہ کو تسلیم کرے مگر صرف نماز کی فرضیت کا انکار کرے تو کافر ہی قرار پائے گا اس صورت میں باقی امورِ اسلامی کا ایمان اس کو کفر سے نہیں بچا سکتا۔

(۲) اسی طرح دائرۂ اسلام سے نکلنے یا کافر ہونے کیلئے اس کا قصد و ارادہ ضروری نہیں ہے۔ شیطان نے کافر ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا مگر اس کی حرکت نے اس کو کافر بنا دیا اور قرآن میں فرمایا گیا کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ اور وہ کافر تھا..... البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی مسلمان سے بے خبری میں کوئی کلمہ نکل جائے تو اس کی فوراً تکفیر نہ کی جائے بلکہ اس کو بتایا جائے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے توبہ کر لو۔ اس پر بھی اگر وہ توبہ نہ کرے اور اپنی بات پر اڑ جائے تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی کیونکہ لزومِ کفر کفر نہیں التزامِ کفر، کفر ہے۔ فافہم

اِرتداد زندقہ اور اِلحاد کی تعریف

ارتداد کے معنیٰ لغت میں لوٹ جانے اور پھر جانے کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں ایمان و اسلام میں داخل ہونے کے بعد کُفر کی طرف لوٹ جانے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں۔

هُوَ الرُّجُوْعُ مِنَ الْاِسْلَامِ اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کا نام اِرتداد ہے۔

اِرتداد کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ علانیہ طور پر مذہب تبدیل کر لے مثلاً اسلام کو ترک کر کے یہودی، عیسائی یا سکھ ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نہ تو مذہب تبدیل کرے اور نہ توحید و رسالت کا انکار کرے لیکن ضروریات دین میں سے کسی امر کا انکار کر دے مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں، روزہ و حج ضروری نہیں تو ایسا شخص کافر و مُرتد دائرۂ اسلام سے خارج ہے اگرچہ وہ صدق دل کے ساتھ اللہ کی تمام صفات پر اور حضور علیہ السّلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لئے کہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا انکار بھی کُفر و ارتداد ہے ۔ اسی طرح ضروریاتِ دین میں ایسی تاویل کرنا اور ان کے ایسے معنیٰ بیان کرنا جو اجماعی عقیدہ کے خلاف ہوں قرآن میں اس کا نام الحاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا جو ہماری آیات میں اِلحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس کا نام زندقہ رکھا گیا ہے، صاحبِ مجمع البحار نے جناب علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت علی کے پاس چند زنادقہ لائے گئے۔

هِیَ جَمْعُ زِنْدِیْقٍ (اِلیٰ قَوْلِهٖ) ثُمَّ اسْتُعْمِلَ فِیْ کُلِّ مُلْحِدٍ فِی الدِّیْنِ وَالْمُرَادُ مِنْهُ قَوْمٌ اِرْتَدُّوْا عَنِ الْاِسْلَامِ (مجمع البحار ص٦٩٥)

زنادقہ، زندیق کی جمع ہے اور لفظ زندیق ہر اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دین میں الحاد و بے جا تاویلات کرے اور اس جگہ مراد ایک مرتد جماعت ہے۔

غرضیکہ اصطلاحِ شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو الفاظ تو اسلام کے کہے مگر معنیٰ ایسے بیان کرے جس سے اس کی حقیقت ہی بدل جائے جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں یہ تاویل کرے کہ قرآن میں صلوٰۃ سے فقط دعا و ذکر مراد ہے اور اس خاص ہیئت سے نماز پڑھنا ضروری نہیں اور زکوٰۃ سے تزکیہ نفس مراد ہے، ایک معیّن نصاب سے مال کی خاص مقدار دینا مراد نہیں ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں اس نوع کی تاویلات کرنا زندقہ و الحاد ہے۔ اور زندقہ الحاد، منافقت سے بھی زیادہ اشد ہے جس طرح منافق طمع کاری سے کام لیتا ہے اسی طرح زندیق اپنے عقائد کفریہ پر تاویلِ فاسد کے ذریعہ اسلامی لیبل لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اسلام کے دھوکے میں اس کے باطنی کفر کو قبول کرلیں۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ :۔

فَاِنَّ الزِّنْدِیْقَ یُمَوِّهُ کُفْرَهٗ وَیُرَوِّجُ عَقِیْدَتَهُ الْفَاسِدَةَ وَیُخْرِجُهَا فِی الصُّوْرَةِ الصَّحِیْحَةِ

شامی ج ٣ ص٣٣٢

تحقیق ملحد و زندیق اپنے کفر پر اسلام کا ملمع کرتا ہے تاکہ اپنے عقیدہ فاسدہ کو اس ملمع کاری کے ذریعہ لوگوں میں رائج کرسکے اور اپنے اس فاسد عقیدہ کو عمدہ طریقہ پر پیش کرسکے

اس لئے کہ الحاد و زندقہ درحقیقت نفاق کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز نے لکھا۔

وَاِنْ اِعْتَرَفَ بِهٖ ظَاهِرًا وَلٰکِنْ یُفَسِّرُ بَعْضَ مَاثَبَتَ مِنَ الدِّیْنِ ضُرُوْرَةً بِخِلَافِ مَا فَسَّرَهُ الصَّحَابَةُ وَالتَّابِعُوْنَ وَاَجْمَعَتْ عَلَیْهِ الْاُمَّةُ فَهُوَ الزِّنْدِیْقُ کَمَا اعْتَرَفَ بِاَنَّ الْقُرْاٰنَ حَقٌّ وَّمَا فِیْهِ مِنْ ذِکْرِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ

اور اگر ضروریات دین کا اقرار تو کرے مگر بعض ان چیزوں کی جو دین میں ثابت ہیں ایسی تفسیر بیان کرے جو صحابہؓ و تابعین اور اجماع امت کے خلاف ہو تو وہ زندیق ہے مثلاً یہ تو اقرار کرے کہ قرآن حق ہے اور اس میں جو جنت و دوزخ کا ذکر ہے وہ بھی حق ہے لیکن جنت سے مراد وہ خوشی اور جنت

حَقٌّ لٰکِنَّ الْمُرَادَ بِالْجَنَّۃِ الْاِبْتِھَاجُ الَّذِیْ یَحْصُلُ بِسَبَبِ الْمَلِکَاتِ الْمَحْمُوْدَۃِ وَالْمُرَادُ بِالنَّارِ النَّدَامَۃُ الَّتِیْ تَحْصُلُ بِسَبَبِ الْمَلِکَاتِ الْمَذْمُوْمَۃِ وَلَیْسَ فِی الْخَارِجِ جَنَّۃٌ وَلَا نَارٌ فَھُوَ زِنْدِیْقٌ (مسوی شرح موطا ج۲ صفہ ۱۳۰)

ہے جو اخلاق حمیدہ سے پیدا ہوتی ہے اور دوزخ سے مراد وہ ندامت ہے جو اخلاقِ مذمومہ کے سبب حاصل ہوتی ہے ویسے کوئی نہ جنّت ہے اور نہ دوزخ (تو ایسی تاویل کرنے والا) زِندیق ہے۔

واضح ہو کہ کُفرِ اِرتداد کی یہ صورت چونکہ دعوٰی اسلام کے ساتھ اور شعائرِ اسلامی کی ادائیگی کے ساتھ ہوتی ہے، اسلئے اس میں اکثر لوگوں کو مُغالطہ ہوتا ہے اور وہ بہک جاتے ہیں، اس لئے یاد رکھئے کہ اسلام کے قطعی اور یقینی احکام میں قرآن و سنت اور اجماعِ امّت سے ثابت شدہ مفہوم کے خلاف کوئی مفہوم قرار دینا اِلحاد زندقہ ہے اور ایسے مُلحدین سے بچنا فی زمانہ تمام فرائض سے اہم فرض ہے۔

فتوٰیٔ تکفیر میں احتیاط نہایت ضروری ہے

خوب یاد رکھئے کہ تکفیر میں کبھی عجلت نہیں کرنی چاہیئے اور اس سلسلہ میں کامل غور و فکر سے کام لینا چاہیئے اور جب تک کسی کا کفر واقعی طور پر ثابت نہ ہو جائے تکفیر نہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ معاملہ بڑا سخت ہے اور فتوٰیٔ تکفیر سے پوری مِلّت اسلامی متاثّر ہوتی ہے، اسی طرح جب کسی امر کا کُفر ہونا واقعی ثابت ہو جائے تو ایسی صورت میں تکفیر نہ کرنا یا تاویلاتِ فاسدہ سے کام لینا یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ کسی کافر کو مسلمان کہہ دینا یا کسی کلمۂ کُفر کو اسلام قرار دے دینا محض ایک لفظی سخاوت نہیں ہے۔ بلکہ مِلّتِ اسلامیہ پر ظلم عظیم ہے کیونکہ اس کے نتائج و عواقب مِلّت کے لئے بڑے عظیم خطرات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور کفر و اسلام بے معنی سی حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اگر کسی کے کلام میں ۹۹ وجوہ کُفر کے ہوں؟

چنانچہ حضراتِ فقہاءِ کرام نے اس مُعاملہ میں اس درجہ احتیاط کا حکم دیا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی مشتبہ کلام سرزد ہو جائے جس میں سو احتمال میں سے ننانوے احتمالات مضمونِ کفر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال عبارت میں اس کا بھی ہو کہ اس کے کوئی

صحیح وجائز معنیٰ بن سکیں تو مفتی پر لازم ہے کہ ننانوے احتمالات کو چھوڑ کر اسی ایک احتمال کی طرف مائل ہو اور تکفیر نہ کرے لیکن یاد رہے کہ یہ احتیاط اسی صورت میں ہے جب کہ واقعی اس عبارت کے ایک صحیح وجائز معنیٰ بن سکیں اور قائل بھی خود اپنے کسی قول وفعل سے اس کی تصریح نہ کر دے۔ میری مراد یہ ہی معنیٰ کفری ہیں تو پھر اس کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ شامیؒ نے لکھا :۔

اِذَا کَانَ فِی الْمَسْئَلَۃِ وُجُوْہٌ تُوْجِبُ الْکُفْرَ	جب کسی مسئلہ میں متعدد وجوہ کفر کے موجود ہوں اور
وَوَجْہٌ وَّاحِدٌ یَمْنَعُ فَعَلَی الْمُفْتِیْ اَنْ یَّمِیْلَ	ایک وجہ مانعِ کفر ہو تو مُفتی پر لازم ہے کہ اس ایک
اِلٰی ذٰلِکَ الْوَجْہِ اِلَّا اِذَا صَرَّحَ بِاِرَادَتِہٖ	وجہ کی طرف مائل ہو مگر جب کہ قائل اس وجہ کی تصریح
مَا یُوْجِبُ الْکُفْرَ فَلَا یَنْفَعُہُ التَّاوِیْلُ	کر دے جو مُوجبِ کُفر ہے تو پھر تاویل سے اس وقت
حِیْنَئِذٍ (شامیؒ)	کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

واضح رہے کہ فقہا کے اس کلام کے بعض جہلا نے یہ معنیٰ لئے ہیں کہ اگر کسی شخص کے عقائد میں ایک عقیدہ یا قول بھی ایمان کا ہو تو اسے مومن سمجھو خواہ وہ کتنے ہی واضح کفری عقائد کیوں نہ رکھتا ہو لیکن ظاہر ہے کہ فقہا کے کلام کا یہ مطلب لینا قطعاً حتماً باطل و مردُود ہے۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو پھر شیطان بھی کافر نہیں رہتا کیونکہ ہر کافر کا کوئی نہ کوئی عقیدہ اور قول تو ضرور ہی ایمان کے موافق ہوتا ہے شیطان بھی تو، توحید و رسالت، حشر و نشر سب کا قائل تھا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ محض ایک اسلامی عقیدہ رکھنے کی بنا پر مسلمان قرار پائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ فقہا کی مذکورہ بالا عبارت کا مطلب صرف یہ ہے، کہ اگر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ جو لغت و عرف کے اعتبار سے مختلف معانی پر محمول ہو سکتا ہے جن میں ایک معنیٰ کے اعتبار سے یہ کلمہ عقیدہ کفریہ سے نکل جاتا ہو اور دوسرے تمام معانی اس کو عقیدہ کفریہ ٹھہراتے ہوں تو ایسی صورت میں مفتی احتیاط کرے اور اس کلام کو صحیح معنیٰ پر محمول کر کے تکفیر سے باز رہے۔ بشرطیکہ وہ خود ایسی تصریح نہ کر دے کہ اس کی مُراد یہی معنیٰ کفری ہیں اور کلام میں واقعی یہ گنجائش بھی ہو کہ وہ صحیح معنیٰ پر محمول ہو سکے۔

مسئلہ تکفیرِ اہلِ قبلہ یہ بات بہت مشہور ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے اور کتبِ عقائد وفقہ میں بھی اس کی تصریح ہے اسی تصریح کے پیشِ نظر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کلمہ گو اہلِ قبلہ ہے لہٰذا اس کی تکفیر ممنوع ہے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلِ قبلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے؛

اصطلاحِ شریعت میں اہلِ قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام قطعیاتِ اسلام اور ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتے ہوں لیکن وہ لوگ جو ضروریاتِ دین کے منکر ہوں۔ مثلاً شراب و زنا و دیگر محرماتِ قطعیہ کو حلال جانیں یا ضروریاتِ دین میں تاویل کریں اور اسلام کے قطعی و یقینی احکام کے ثابت شدہ مفہوم و معنیٰ میں ایجاد سے کام لیں تو ایسے لوگ ہرگز ہرگز اہلِ قبلہ نہیں ہیں۔

۲۔ اور فقہا نے جو یہ فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قبلہ کی گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر تکفیر نہ کی جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اہلِ قبلہ اگر ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار کر دیں تو بھی ان کو کافر نہ کہا جائے۔ چنانچہ ان امور کی تصریح و توضیح خود ائمۂ دین و فقہاء کرام نے فرمائی ہے چند اقوالِ ائمہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ملّا علی قاری شرحِ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں۔

اِعْلَمْ اَنَّ الْمُرَادَ بِاَهْلِ الْقِبْلَةِ الَّذِيْنَ اِتَّفَقُوْا عَلٰى مَا هُوَ مِنْ ضُرُوْرِيَاتِ الدِّيْنِ	جاننا چاہیئے کہ اہلِ قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین پر متفق ہوں۔
(۲) فَمَنْ وَاظَبَ طُوْلَ عُمْرِهٖ عَلَى الطَّاعَاتِ وَالْعِبَادَاتِ مَعَ اِعْتِقَادِ قِدَمِ الْعَالَمِ وَ نَفِيِ الْحَشْرِ اَوْ نَفْيِ عِلْمِهٖ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى بِالْجُزْئِيَاتِ لَا يَكُوْنُ مِنْ اَهْلِ الْقِبْلَةِ	پس جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات کا پابند ہونے کے باوجود قدمِ عالم اور نفیِ حشر یا نفیِ علم اللہ بالجزئیات کا معتقد ہو وہ اہلِ قبلہ نہیں ہے۔
(شرح فقہ اکبر صہ ۱۸۹)	(شرح فقہ اکبر)

اہل قبلہ کی تعریف محقق ابن امیر الحاج شرح تحریر الاصول میں فرماتے ہیں۔

(۳) هُوَ الْمُوَافِقُ عَلٰى مَا هُوَ مِنْ ضُرُوْرِيَاتِ الْإِسْلَامِ (شرح تحریر الاصول)

اہل قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ اسلام میں موافق ہوں۔

(۴) شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں ہے۔

أَهْلُ الْقِبْلَةِ فِي اِصْطِلَاحِ الْمُتَكَلِّمِيْنَ مَنْ يُّصَدِّقُ بِضُرُوْرِيَاتِ الدِّيْنِ۔ نبراس ص ۵۷۲

اہلِ قبلہ متکلّمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے۔

(۵) شرح مقاصد مبحث سابع میں ہے۔

فَلَا نِزَاعَ فِي كُفْرِ أَهْلِ الْقِبْلَةِ الْمُوَاظِبِ طُوْلَ الْعُمُرِ عَلَى الطَّاعَاتِ بِاعْتِقَادِ قِدَمِ الْعَالَمِ وَنَفْيِ الْحَشْرِ الخ

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے اس شخص کو کافر کہا جائے گا جو اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزارے مگر عالم کے قدیم ہونے یا قیامت و حشر کا انکار کرے۔

(۶) لَا يُكَفَّرُ أَهْلُ الْقِبْلَةِ إِلَّا فِيْمَا فِيْهِ إِنْكَارُ مَا عُلِمَ مَجِيْئُهُ بِهِ بِالضُّرُوْرَةِ أَوْ أُجْمِعَ عَلَيْهِ كَاسْتِحْلَالِ الْمُحَرَّمَاتِ (مواقف)

اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے گی مگر اس صورت میں کہ اس میں ضروریاتِ دین کا انکار یا ایسی چیز کا انکار لازم ہو جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جیسے حرام اشیاء کو حلال سمجھنا۔

(۷) لَا خِلَافَ فِي كُفْرِ الْمُخَالِفِ فِي ضُرُوْرِيَاتِ الْإِسْلَامِ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ شامی ج ۱ ص ۲۷۷

جو شخص ضروریاتِ اسلام کا مخالف ہو اس کے کفر میں کوئی اختلاف نہیں، اگرچہ وہ اہلِ قبلہ میں سے ہو۔

(۸) وَمَعْنٰى عَدَمِ تَكْفِيْرِ أَهْلِ الْقِبْلَةِ أَنْ لَا يُكَفَّرَ بِارْتِكَابِ الْمَعَاصِيْ وَلَا

اور فقہا نے جو یہ کہا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے

بِإِنْكَارِ الْأُمُوْرِ الْخَفِيَّةِ غَيْرِ الْمَشْهُوْرَةِ (نبراس صـ۵۷۲)

اور اسلام کے ایسے امور کے انکار کی وجہ سے جو کہ مشہور نہ ہوں تکفیر نہ کی جائے۔

(۹) فتح المغیث شرح الفیہ الحدیث میں ہے۔

إِذْ لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِّنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ إِلَّا بِإِنْكَارِ قَطْعِيٍّ مِّنَ الشَّرِيْعَةِ (شرح الفیہ صـ۱۳۳ و عقائد عضدیہ)

ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے مگر بسبب انکار کسی حکم قطعی کے۔

(۱۰) امام ربّانی مجدّد الف ثانی مکتوبات میں فرماتے ہیں۔

و چوں ایں فرقۂ مبتدعہ اہلِ قبلہ اند در تکفیر آنہا جرأت نباید نمود تا زمانے کہ انکارِ ضرورتِ دینیہ نمایند و رد متواتراتِ احکام شرعیہ نکنند و قبول مَا عُلِمَ مَجِيْئُهُ مِنَ الدِّيْنِ بِالضَّرُوْرَةِ نکنند (مکتوبات ۳۸ ج۲ صـ۹/۸)

اور چونکہ یہ فرقۂ مبتدعہ اہلِ قبلہ ہیں اس لیے اُن کی تکفیر میں جرأت نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ ضروریاتِ دین کا انکار اور متواتراتِ احکامِ شرعیہ کو رد نہ کریں اور ضروریاتِ دین کو قبول نہ کریں۔

فقہاءِ کرام و ائمۂ متکلمین کی ان تصریحات سے واضح ہوا۔

(۱) اہلِ قبلہ وہ نہیں ہیں جو صرف کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں بلکہ اہلِ قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین اور اسلام کے قطعی و یقینی امور پر ایمان رکھتے ہوں اور انہیں تسلیم کرتے ہوں اور دین کی کسی بھی ضروری بات کے منکر نہ ہوں

(۲) فقہا نے جو فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اگر وہ کفر و شرک کے علاوہ کسی گناہ میں ملوث ہو جائیں مثلاً شراب پئیں، زنا کریں، تو گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے

ان کی تکفیر جائز نہ ہوگی جیسے خوارج و معتزلہ مُرتکب کبیرہ کی تکفیر کرتے ہیں ۔

(۳) لیکن اگر اہلِ قبلہ جو نماز بھی پڑھیں اور تمام عمر عبادات و طاعات میں گذاریں اور اس کے باوجود ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کردیں تو اب ان کی تکفیر کی جائے گی ۔

کفر و شرک و ارتداد کے دُنیوی و اخروی احکام

کتاب و سنت میں کفر کے حسبِ ذیل دُنیوی و اخروی احکام بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں اور ان احکام پر تمام اہل اسلام کا اتفاق بھی ہے

(۱) کفر کا اخروی حکم یہ ہے کہ اس کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور کافر و مشرک کی بخشش نہیں ہے قرآن مجید میں فرمایا ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ	اللہ تعالیٰ مشرک کی بخشش نہیں فرمائے گا ۔ جو لوگ کافر ہوئے اور ظلم کیا انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں بخشے گا ۔

(۲) کفّار و مرتدّین ملحدین و زنادقہ سے میل جول سلام کلام موالات وغیرہ حرام و ممنوع ہے ۔

(۳) کفّار سے مناکحت حرام ہے ۔ (۴) کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ۔

(۵) کافر کی نمازِ جنازہ میں شریک ہونا یا اس کی قبر پر جانا یا اس کے لئے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے قرآن مجید میں فرمایا :۔

لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ	ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیے ان کی قبر پر کھڑے نہ ہوجیے اس لئے کہ وہ اللہ و رسول کے منکر ہوئے اور نافرمان مرے ۔
مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی ۔	نبی کو اور مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ وہ مشرکوں کی مغفرت کی دعا کریں اگرچہ وہ ان کے قرابتدار ہوں ۔

(۶) کافر کا ذبیحہ اور شکار مسلمان کے لئے حلال نہیں (۷) کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں

(۸) جو کافر دار الاسلام میں مسلمانوں کی رعایا ہوں ان کو فوج میں بھرتی کر کے جہاد میں لے جانا جائز نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ سازش کر کے دار الحرب کے کفار سے جا ملیں۔ (۹) جو کافر اسلامی حکومت میں رہتے ہوں ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ قرآن مجید میں فرمایا۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ
یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر۔

(۱۰) کسی کافر مرتد کو کوئی وزارتی یا فوجی یا افسری کسی قسم کا کلیدی عہدہ دینا اور اس کو مسلمان کا سردار بنا دینا اور کفار سے سیاسی و مملکتی امور میں مشورہ لینا جائز نہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو موسیٰ کو ہدایت کی تھی۔

وَلَا تُكْرِمُوْهُمْ وَقَدْ اَهَانَهُمُ اللّٰهُ — کافروں کا اعزاز و اکرام نہ کرو، اللہ نے ان کی اہانت
وَلَا تَأْمَنُوْهُمْ وَقَدْ خَوَّنَهُمُ اللّٰهُ — کا حکم دیا ہے، ان کو امین اور امانت دار نہ سمجھو اللہ
وَلَا تَسْتَعْمِلُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ الخ — نے ان کو خائن بتلایا ہے۔ یہود و نصاریٰ کو کوئی
(قرطبی ج ۴ ص ۱۷۹) — عہدہ نہ دو۔

حضرت فاروق اعظم کا یہ حکم قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا — بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔

ظاہر ہے کہ دشمن کو کلیدی آسامیوں پر فائز کر دینے کا نتیجہ بہرحال اسلام و مسلمین کی ذلت و رسوائی ہوگا۔ اور تاریخ گواہ ہے جب بھی کسی مسلمان حکمران نے کافر و مشرک یا مرتد کو کسی عہدہ پر فائز کیا ہے تو بُرے وقت میں اس نے غداری ہی کی ہے مجھے یہاں مرتدوں و منافقوں کی نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہی آپ کو بتا دے گا کہ ممالکِ اسلامی کی تباہی و بربادی میں اصل ہاتھ انہیں کفار و مرتدین ہی کا رہا ہے۔

بلکہ کھلے ہوئے کافر ہندو سکھ عیسائی وغیرہ اتنا نقصان اسلام کو نہیں پہنچا سکے جتنا کہ مرتدوں اور منافقوں نے پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت کی نصوصِ واضحہ ہیں مُرتد کی سزا موت ہے اور قتلِ مُرتد پر علمائے اُمت کا اجماع ہے

(۱) حافظ عسقلانی فتح الباری صفحہ ۱۷۰ جلد ۱۲ میں فرماتے ہیں۔

قَالَ ابْنُ دَقِيْقِ الْعِيْدِ الرِّدَّةُ سَبَبٌ لِإِبَاحَةِ دَمِ الْمُسْلِمِ بِالْإِجْمَاعِ فِي الرَّجُلِ وَأَمَّا الْمَرْأَةُ فَفِيْهَا خِلَافٌ

(فتح الباری صفحہ ۱۷۰ جلد ۱۲ کتاب الدیات)

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرتد ہونا یعنی دینِ اسلام سے پھر جانا بالاتفاق مرد کے حق میں موجبِ قتل ہے البتہ اگر عورت دین اسلام سے پھر جائے تو اس کے قتل میں اختلاف ہے۔

(۲) حافظ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

وَقَالَ شَيْخُنَا فِي شَرْحِ التِّرْمِذِيِّ وَقَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى قَتْلِ الْمُرْتَدِّ إِذَا لَمْ يَرْجِعْ إِلَى الْإِسْلَامِ وَأَصَرَّ عَلَى الْكُفْرِ وَاخْتَلَفُوْا فِي قَتْلِ الْمُرْتَدَّةِ فَجَعَلَهَا أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ كَالرَّجُلِ الْمُرْتَدِّ وَقَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ لَا تُقْتَلُ الْمُرْتَدَّةُ لِعُمُوْمِ قَوْلِهِ نَهَى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ

(عمدۃ القاری ص۴۱ ج ۲۴ کتاب الدیات باب قولہ تعالی النفس بالنفس والعین بالعین)

ہمارے شیخ نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے علماء نے قتل مرتد پر اجماع فرمایا ہے جب کہ وہ ارتداد پر قائم رہے اور اسلام کی طرف نہ لوٹے اور کفر پر مداومت اختیار کرے اور مرتد عورت کے قتل میں اختلاف ہے اکثر علمائے نے مرتد عورت کو بھی مثل مرد کے واجب القتل قرار دیا ہے اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مرتد عورت کو قتل نہ کیا جائے بوجہ عمومِ قولِ پیغمبر علیہ السلام کے کہ آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے

(کذا فی عمدۃ القاری)

(۳) شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالی میزان کبری میں فرماتے ہیں۔

قَدِ اتَّفَقَ الْأَئِمَّةُ عَلَى أَنَّ مَنِ ارْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ وَجَبَ قَتْلُهُ

ائمہ نے اتفاق فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام لاکر اس سے پھر جائے تو اس کا قتل واجب ہے۔

ایمان کی تعریف میں ائمہ کا اختلاف

حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

اِنَّ الْاِیْمَانَ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَمَعْرِفَۃُ الْقَلْبِ

ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو کہتے ہیں۔

معرفتِ قلب کے معنیٰ پختہ اور غیر متزلزل اعتقاد کے ہیں یعنی ایمان فقط دل کے اعتقاد جازم کا نام ہے اور زبان سے اقرار کرنا شرط ہے۔ چنانچہ شرح عقائد میں ہے ۔

وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الْمُحَقِّقِیْنَ اِلٰی اَنَّهٗ هُوَ التَّصْدِیْقُ بِالْقَلْبِ وَالْاِقْرَارُ شَرْطٌ لِاِجْرَاءِ الْاَحْكَامِ فِی الدُّنْیَا لِمَا اَنَّ تَصْدِیْقَ الْقَلْبِ اَمْرٌ بَاطِنٌ لَابُدَّ مِنْ عَلَامَةٍ فَمَنْ صَدَّقَ بِقَلْبِهٖ وَلَمْ یُقِرَّ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰی

(شرح عقائد)

جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور اقرار لسانی صرف دنیوی احکام جاری ہونے کی ایک شرط ہے کیونکہ تصدیق قلبی ایک امر پوشیدہ ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کیلئے کوئی علامت ظاہری ہونی چاہیئے لہٰذا جو شخص دل سے (تمام ضروریاتِ دین) کی تصدیق کرے اور زبان سے (کسی کے سامنے) اس کا اقرار و اظہار نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے۔

معلوم ہوا کہ زبان سے اقرار کرنا صرف اس لئے ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص مومن ہے کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرے گا اس کے دل کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہو سکتی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اقرارِ لسانی شرط ہے۔

ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اس کے عقلی و نقلی دلائل

ایمان دل کے اعتقاد کو کہتے ہیں۔ اس کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

(١) عربی زبان میں اٰمنوا باللّٰہِ کا اولیں مفہوم تصدیق ہی سمجھا جاتا ہے اور اس معنیٰ سے عدول کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے۔

(٢) ایمان کا محل دل ہی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں دل کو ایمان کا محل قرار دیا گیا ہے۔

(۱) اُولٰٓئِکَ کَتَبَ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ یہ وہ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان کو پختہ کردیا۔

(۲) مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاھِھِمْ وَلَمْ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو زبان سے ایمان کا اقرار
تُؤْمِنْ قُلُوْبُھُمْ (مائدہ) کرتے ہیں مگر دل سے ایمان نہیں لاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے۔

(۳) حضرت اسامہؓ نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے زبان سے کلمہ پڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص دل سے کلمہ نہیں پڑھ رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: اسامہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے لہٰذا دل کی تصدیق کا نام ایمان ہوا۔

(۴) اہل کتاب اور فرعون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی جانتے تھے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔ اس کی وجہ یہی تو تھی کہ وہ دل سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تصدیق نہیں کرتے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔

(۵) کفر ایمان کی ضد ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں کفر کے مقابل ایمان کو ذکر کیا گیا ہے جیسے اس آیت میں مَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ اور یہ ظاہر ہے کہ کفر کے معنیٰ جھٹلانے اور انکار کرنے کے ہیں اور یہ دل ہی کا فعل ہے۔ لہٰذا جب کفر دل کا فعل ہے تو کفر کی ضد ایمان بھی دل کا فعل ہی ہونا چاہئے اور دل کا فعل عبارت ہے تصدیق سے اور تکذیب کی ضد تصدیق ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ اور اعمال صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہیں۔

(۶) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اس آیت میں منافقین سے ایمان

نوٹ:

کی نفی کی گئی ہے حالانکہ منافق زبان سے اقرار کرتے تھے مگر چونکہ دل سے تصدیق نہیں کرتے تھے اس لئے ایمان کی نفی کر دی گئی ۔

(۷) اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ ۔ اس آیت میں مُکرَہ کے لئے یہ جائز قرار دیا گیا کہ وہ جان بچانے کے لئے زبان سے اقرار کر دے مگر اس زبانی انکار کے باوجود اس کو مومن قرار دیا گیا اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اس میں تصدیق قلبی پائی جا رہی ہے ۔

(۸) (۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (۳) اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ ...... الخ ان آیات میں ایمان کا عطف اعمالِ صالح پر کیا گیا اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے یعنی معطوف معطوف علیہ میں داخل نہیں ہوتا ۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اعمالِ صالح حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ۔

(۹) وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ اس آیت میں اعمال کی صحت ایمان پر موقوف قرار دی گئی ہے اور مشروط شرط میں داخل نہیں ہوتا ورنہ اِشْتِرَاطُ الشَّیْئِ فِیْ نَفْسِہٖ لازم آئے گا جو باطل ہے ۔

(۱۰) قرآن میں مُرتکبِ حرام کو مومن کہا گیا ہے جیسے اس آیت میں وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا حالانکہ یہ امر قطعی ہے کہ شیء رکن کے بغیر متحقق نہیں ہوتی تو اگر اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہوتے تو مُرتکبِ حرام کو مومن نہ کہا جاتا ۔

(۱۱) قرآن میں جہاں روزہ ، نماز اور وضو کا حکم دیا ہے وہاں یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے لفظ سے خطاب کیا ہے ۔ اس کے بعد ان کو عمل کی تکلیف دی ہے ۔ یہ بات بھی ایمان سے عمل کے خروج پر دلالت کرتی ہے ورنہ تکلیف تحصیلِ الحاصل لازم آئے گی جو باطل ہے ۔

(۱۲) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو توبہ کا حکم دیا ہے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً الخ

یہ بات بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معصیت ایمان کے منافی نہیں معصیت کے ساتھ ایمان بھی ہوتا ہے کیونکہ توبہ گنہگار کیلئے ہوتی ہے۔ نیز گنہگار کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومن قرار دیا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

توحید

اللہ عزّوجل کی ہستی پر اعتقاد کے ساتھ ساتھ اس کی توحید پر ایمان لانا بھی ضروریاتِ دین سے ہے اور مسلمان ہونے کیلئے توحید کا اقرار و اعتقاد بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خود خدا کے وجود کا اعتراف بلکہ خدا کے وجود کے اقرار کو خدا کا واحد ہونا لازم ہے۔ جب آپ ایک قادرِ مطلق خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف کریں گے تو پھر لامحالہ آپ کو اس خالق صانع اور قادرِ مطلق کی توحید کا اقرار بھی کرنا پڑیگا۔

اللہ عزّوجل کے ایک ہونے اور اپنی ذات و صفات میں دجیسی کہ اس کی شایانِ شان ہیں، یکتا اور اکیلا ہونے پر بے شمار دلائل عقلی و نقلی قائم ہیں کتابِ مجید میں اعلان کیا گیا۔

(۱) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ تم فرماؤ وہ خدا ایک ہے اللہ بے نیاز ہے۔

حضرت ابن عباس، حسن و سعید بن جبیر نے فرمایا: اللہ الصمد کے معنی یہ ہیں کہ اس کو کسی کا خوف نہیں ہے وہ کھاتا پیتا نہیں۔

(۲) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (شوریٰ) اس کی مثل کوئی چیز نہیں وہ سننے والا دیکھنے والا ہے

(۳) هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن) وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

(۴) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وہ ہے اللہ تمہارا رب اسی کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔

(۵) اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (بقرہ) اللہ۔ اس کے سوا اور کی بندگی نہیں وہی جیتا ہے اور سب اسی کے سہارے جیتے ہیں۔

یہ اور اسی مضمون کی متعدّد آیات ہیں جن میں اللہ عزّوجل کے ایک ہونے اور اپنی ذات و صفات میں یکتا ہونے اور شریک سے پاک و منزّہ ہونے کا بیان ہے۔

عقلی دلیل پھر عقل یہ بھی چاہتی ہے کہ اس عالم کا خالق و صانع ایک ہو دو نہیں اور اس دعویٰ پر سب سے عمدہ دلیل جسے خود قرآن نے بھی پیش کیا ہے۔ "وہ نظامِ عالم کی یکسانی و وحدت" اور کائنات کے عِلَل و اسباب کا باہم توافق و تعاون اور اشتراک و اتّحاد ہے۔

دنیا کا کوئی ذرہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوّتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں۔

ایک دانہ کے اُگنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ:۔

دانہ اُگنے کے لائق ہو — زمین میں اگانے کی صلاحیت ہو — موسم بھی اسکے مناسب ہو — بارش موافق ہو۔ آفتاب کی گرمی و روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم پہنچے۔

پھر اس کے بعد وہ تمام رکاوٹیں یکسر دفع ہوں جو اس کی نشو و نما میں مُخل ہو سکتی ہیں ان سب مراحل کے بعد دانہ اُگتا ہے اور پھر پھل لاتا ہے۔ کتاب مجید نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا۔

لَوْ کَانَ فِیْھِمَا اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا	اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا
فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ	چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے تو
(الانبیاء - ۲)	پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

غرضکہ توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی سب سے اہم دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے۔ چاند سورج اور تاروں سے لیکر انسان۔ حیوان۔ پانی۔ ہوا۔ درخت۔ گھاس پات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک

مقرّرہ نظام اور ایک بندھے تُلے اصول کے ماتحت ہیں اور ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور یہ بات اس امر کی دلیل ہے۔ یہ سب کسی ایک ہستی کے اشارہ پر چل رہا ہے۔ اگر آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار ایک کی بجائے دو طاقتوں کے ہاتھ میں ہوتے۔ تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کیلئے بھی قائم نہ رہتے۔

اہلِ فلسفہ کی زبان میں اسی دلیل کو یوں ادا کیا جا سکتا ہے۔

یہ کائنات معلول ہے اور اس کی کوئی علّتِ تامّہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علّتِ تامّہ نہیں ہو سکتیں کیونکہ علّتِ تامّہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب اگر اس کائنات کی علّتِ تامّہ ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علّتِ تامّہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علّتِ تامّہ کا انتظار رہے گا یا نہیں۔ اگر رہے گا تو پہلی شے علّتِ تامّہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علّتِ تامّہ نہ ہوں گی۔ اس سے واضح ہوا کہ عالم کی علّتِ تامّہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو قرآن مجید نے ان دو آیتوں میں یوں ادا کیا ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ (ملک ۱۱)	تو خدا کے بنانے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ نگاہ رکھ کیا کوئی خلل تجھے دکھائی دیتا ہے۔
فَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (مومنون ۵)	اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

دنیا کی مشہور قوموں میں عیسائی اور یہودی تو توحید کے علانیہ منکر ہیں۔

عیسائی تین خداؤں کے قائل ہیں۔ قرآن نے ان کے اس عقیدہ کی صاف و صریح طور پر تردید کی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ	بے شک وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ   کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ بیشک خدا تین سے تیرا ہے

مجوسیوں کا کہنا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں باہم متضاد ہیں خیر و شر نور و ظلمت فسق و صلاح وغیرہ یہ سب یکدوسرے کی ضد ہیں اسلئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہوسکتا اور نہ لازم آئیگا کہ خدا شر کو بھی پیدا کرتا ہے اور جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں انکے اس خیال کی تردید کیگئی اور بتایا گیا جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور خیر و شر کا خالق بھی ایک ہی اللہ ہے اور اچھی یا بری چیزوں کا پیدا کرنا بہرحال کمال ہے کیونکہ حسن و قبح کا تعلق تو اس چیز سے ہے نہ کہ خالق سے۔ اسلئے اچھی چیزوں کیلئے الگ اور بری چیزوں کیلئے الگ خالق تسلیم کرنے کی کیا ضرورت؟

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ   اور خدا نے فرمایا دو خدا نہ بناؤ۔ وہ ایک خدا ہے
اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ وَلَهٗ   تو مجھ سے ڈرو اور اسی کیلئے ہے جو آسمان میں ہے
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ   اور زمین میں۔

توحید کے ایجابی اور سلبی اجزاء یہ تو ہے توحید پر نہایت ہی مختصر سی گفتگو۔ اب اگر توحید کے سلبی اور ایجابی اجزاء پر گفتگو کی جائے تو اس کے لئے طویل مضمون کی ضرورت ہے تاہم میرا خیال ہے کہ اگر توحید کی ضد شرک کی تعریف اور عبادت کی تعریف آپ کے سامنے پیش کردی جائے تو اس سے توحید کے سلبی اور ایجابی اجزاء کی کچھ نہ کچھ نشاندہی ہوسکتی ہے۔

شرک کی تعریف شرک کے معنی ہیں اللہ کے سوا کسی اور کو خدا جاننا یا عبادت کے لائق سمجھنا یا خدا کی صفات جیسی کہ اس کی ہیں کسی اور میں ماننا۔ اس کا ہر کمال ابدی ہے۔ کسی نے اس کو دیا نہیں۔ وہ خود بخود علیم، خبیر، عالم الغیب قادر اور مختار ہے تو بالکل اسی طرح غیر اللہ میں کسی صفت کو مانا جائے تو یہ یقیناً شرک ہے اور اگر اس طرح نہ مانا جائے تو یہ ہرگز ہرگز شرک نہیں، شرح عقائد میں ہے۔

اَلْاِشْرَاكُ هُوَ اِثْبَاتُ الشَّرِيْكِ فِي الْاُلُوْهِيَّةِ   شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیت میں شریک ثابت
بِمَعْنٰى وَاجِبُ الْوُجُوْدِ كَمَا لِلْمَجُوْسِ اَوْ بِمَعْنٰى   کیا جائے بمعنی واجب الوجود جیسے مجوس کرتے ہیں،

اِسْتِحْقَاقِ الْعِبَادَةِ كَمَا لِعَبَدَةِ الْاَصْنَامِ (شرح عقائد) یا بمعنی استحقاقِ عبادت جیسا بت پرست کرتے ہیں۔

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں: بالجملہ شرک سہ قسم است در وجود و در خالقیت و در عبادت ۔ (جلد اول ص ۶۱)

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شرک تین طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ کی طرح کسی کو واجب الوجود جانے۔ دوم یہ کہ اور کو اللہ کے سوا خالق جانے۔ سوم یہ کہ غیر خدا کی عبادت کرے (یا اس کو مستحق عبادت سمجھے)

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) واجب الوجود اپنی ذات اور کمالات میں دوسرے سے بالکل بے نیاز اور غنی بالذات صرف ایک اللہ عزوجل ہے اور فقط وہی عبادت کا مستحق ہے اور کوئی نہیں۔ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو واجب الوجود مانے یعنی یہ کہے کہ یہ شخص اپنی ذات اور کمالات میں کسی کا محتاج نہیں ہے یا اللہ کے سوا کسی اور کو عبادت کا مستحق ٹھہرائے وہ یقیناً مشرک ہے جیسے ہندوستان کے آریہ روح اور مادہ کو قدیم مانتے ہیں اور واجب الوجود سمجھتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ روح اور مادہ کی ذات بنانے والے سے بے نیاز ہے یہ مشرک ہیں (۳) اسی طرح اگر کوئی کسی کے کمالات کو ذاتی مانے اور اس کمال میں اس کو دوسرے سے غنی اور بے نیاز سمجھے تو مشرک ہے خواہ وہ کمال علم ہو یا قدرت یا سمع یا بصر ہو جیسے ستارہ پرستوں کا خیال ہے کہ عالم کے تغیرات کواکب کی تاثیرات سے ہیں اور کواکب ان تاثیرات میں غنی بالذات ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں۔ یہ عقیدہ بھی شرک ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے مشرک۔ اسی طرح اگر کوئی کسی دوسرے کی عبادت کرے جس کو ہندی میں پوجا اور فارسی میں پرستش کہتے ہیں یہ بھی شرک ہے۔ جیسے بت پرست بتوں کو مُستحقِ عبادت سمجھتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں یہ مشرک ہیں لیکن جو لوگ اللہ کے عطا کئے ہوئے کمالات اس کے بندوں میں مانتے ہیں اور کمالات کو عطاءِ الٰہی جانتے ہیں وہ ہرگز مشرک نہیں مثلاً کوئی شخص آدمی کو سمیع و بصیر کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صفت سمع و بصر عطا فرمائی ہے تو وہ مومن اور

مُوحّد ہے مشرک نہیں۔ مشرک جب ہوتا کہ یہ مانتا کہ آدمی میں سمع و بصر کی صفت ذاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ عزّ وجل کی صفات میں سمیع و بصیر ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود انسان کو بھی سمیع و بصیر قرار دیا ہے۔

فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا اور یہ شرک اس لئے نہیں کہ انسان میں جو صفت سمیع و بصیر ثابت کی گئی ہے وہ عطائی ہے اور خدا میں ذاتی ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں کتاب و سنّت سے دی جاسکتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہی نکلتا ہے کہ کسی بھی کمال کو جو ممکن البشر ہے غیر اللہ میں عطائی مانا جائے تو شرک نہیں اور ذاتی مانا جائے تو شرک ہے۔ اگر ذاتی و عطائی کا فرق نہ کیا جائے تو پھر انسان ہر بات میں مشرک ہو جائے۔ مثلاً یہ کہے کہ میں سنتا ہوں میں دیکھتا ہوں۔ میں موجود ہوں۔ غذا نے قوت دی۔ پانی نے پیاس بجھائی۔ آگ نے جلا دیا۔ سردی نے نقصان پہنچایا۔ دوا نے فائدہ دیا۔ یہ سب باتیں شرک ہو جائیں حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں تو وہ اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دیکھنے کی قوت مجھ میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے خود بخود نہیں ہے

جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ دوا نے شفا دی تو اس عقیدہ کے ساتھ کہتا ہے کہ دوا میں شفا دینے کی طاقت اور تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اگر خدا نہ چاہے تو نہ میں دیکھ سکوں اور نہ دوا اپنا اثر دکھا سکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کمال کو غیر اللہ میں اگر ذاتی مانا جائے تو وہ شرک ہے اور اگر عطائی طور پر مانا جائے تو ہرگز شرک نہیں۔

جو شخص عطائی کمال کو غیر اللہ میں ماننے کو شرک کہتا ہے وہ جاہل ہے اور اگر جان بوجھ کر کہتا ہے تو خود گمراہ ہے کیونکہ اس نے عطائی کمال ماننے والے کو مُشرک کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات اور صفات عطائی ہیں اور وہ مستغنی اور بے نیاز نہیں ہے۔

عبادت کے معنیٰ عبادت کے معنیٰ انتہا تذلیل اور غایتِ خضوع کے ہیں یعنی انسان اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلّت وپستی کے اس آخری درجے میں سمجھے کہ جس کے بعد عاجزی اور ذلّت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو اس قسم کی عاجزی کرنے والا عابد ہے اور ایسی عاجزی عبادت ہے۔ عبادت کا تعلّق نہ تو مافوق الاسباب امور سے ہے اور نہ غائبانہ ندا سے۔ بلکہ اس کا تعلّق محض اعتقاد سے ہے اور ظاہر ہے ایسی عاجزی اور ایسی ذلّت وپستی کا اظہار اسی ہستی کیلئے کیا جا سکتا ہے جس کے متعلّق صفات مستقلہ کا اعتقاد رکھا جائے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں خود بخود اس میں موجود ہیں کسی نے اس کو کوئی صفت دی نہیں اور یہ صفات ذاتیہ استحقاقِ عبادت کا مناط ومدار ہیں۔ ان صفاتِ ذاتیہ کا کسی میں ثابت کرنا استحقاقِ عبادت والوہیت کا ثابت کرنا ہے اور جو صفت استحقاقِ عبادت کا مناط ہے خواہ وہ علم ہو یا قدرت تصرف ہو یا خالقیت، ان کا ذاتی اور مستقل ہونا ضروری ہے ورنہ افرادِ ممکنات کا مستحقِ عبادت ہونا لازم آئے گا کیونکہ عطائی غیر مستقل حادث صفات، افرادِ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ استحقاقِ عبادت کیلئے صفاتِ مستقلہ لازم ہیں اور صفات مستقلہ کے لئے استحقاقِ عبادت لازم ہے۔ کسی کو مستحقِ عبادت کہنا اس کے لئے استقلال ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مستقل بالذات ماننا مستحق عبادت قرار دینا ہے۔

عبادت وتعظیم میں فرق یہیں سے عبادت وتعظیم میں فرق معلوم ہو گیا۔ عبادت میں تعظیم بھی ہوتی ہے اور جس کی تعظیم کی جائے اس کی الوہیت اس کے واجب الوجود اور مستحقِ عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہوتا ہے اور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا یعنی ہر عبادت تعظیم ہے مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے لہٰذا غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تعظیم شرک نہیں بلکہ جائز بلکہ بعض کی تعظیم فرضِ عین ہے مثلاً قرآن پاک کی انبیاء کرام علیہم السلام وملائکہ کی تعظیم وتوقیر اور بعض کی تعظیم واجب ہے مثلاً والدین کی بعض لوگ تعظیم وعبادت میں فرق نہیں کرتے بلکہ انکے مفہوم سے جاہل ہیں۔ جہاں وہ غیر اللہ کی تعظیم ہوتی دیکھتے ہیں جھٹ شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ بات بدیہی ہے کہ تعظیم کی وہی صورت شرک قرار دی جائے گی جس میں معظّم کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔

اس کے علاوہ تعظیم کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہیں، ان میں سے بعض ناجائز و حرام تو ہو سکتی ہیں مگر شرک و کفر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں مثلاً قبر کو سجدہ کرنا اور مقبور کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کا عقیدہ رکھ کر اور اس کے لئے صفاتِ مستقلہ کو مان کر سجدہ کرنا شرک ہے لیکن اگر یہ اعتقاد نہ ہو اور پھر غیر اللہ کی تعظیم کی جائے اس میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس تعظیم کی کچھ صورتیں ناجائز و حرام ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اعتقاد کے ساتھ جو تعظیم کی جائے وہ شرک قرار پائے۔ سجدہ ہی کو لے لیجئے مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگر شرک مان لیا جائے تو پھر (معاذ اللہ) تمام ملائکہ اور برادرانِ یوسف علیہ السلام بھی مشرک قرار پائیں گے کیونکہ قرآن پاک نے بہ تصریح کی ہے کہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ خود اللہ عزّ و جل نے شرک کا حکم دیا (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السّلام کو سجدہ کرنا اور برادرانِ یوسف کا جناب یوسف علیہ السّلام کو سجدہ کرنا ان کو واجب الوجود جان کر سجدہ کرنا نہ تھا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کی مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے لئے سجدہ تھا جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو تعظیم معظّم کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے عقیدہ کے ساتھ نہ کی جائے وہ شرک ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ہم اہلِ سنت و جماعت انبیاء کرام و بزرگانِ عظام کی تعظیم ضرور کرتے ہیں ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں مگر انہیں اللہ نہیں مانتے اور نہ استقلال ذاتی ان کیلئے ثابت کرتے ہیں اور نہ انہیں مستحق عبادت جانتے ہیں اور نہ واجب الوجود لہٰذا ہم پر محض تعظیم کے جرم میں وہابیہ و دیوبندیہ کا شرک کا فتویٰ دینا کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ ہم تعظیم کی ان صورتوں کو بھی نہیں اپناتے جو ناجائز و حرام ہیں اور جن کے جائز ہونے پر دلائلِ شرعیہ مل جاتے ہیں، جیسے سجدہ تعظیمی ہم اس کو حرام و ناجائز سمجھتے ہیں کیونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ فافہم)

اسلام میں عبادت کا تصوّر

لفظ عبادت دنیا کے ہر مذہب میں موجود ہے۔ ہر مذہب کے بانی نے اپنے پیروؤں کو عبادت کا حکم دیا اور اس کا طریقہ بھی ہر مذہب نے علیحدہ علیحدہ مقرر کیا ہے لیکن عبادات کی جو حقیقت و تشریح اسلام نے کی ہے وہ ایسی ہے جس کو معلوم کر کے ہر سلیم العقل اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ واقعی عبادت یہ ہے اور دیگر مذاہب نے جو عبادت کا طریقہ اور تشریح کی ہے کہیں تو وہ نامکمل ہے اور کہیں اس کی روح ہی مفقود ہے اور کہیں ایسے افعال کو عبادت میں شمار کر لیا ہے جو فطرتاً و عقلاً عبادت ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے ہیں۔

عرب ہی کو لیجئے ان کی عبادت یہ تھی کہ دنیا کے عیش و آرام اور اس کی لذّتوں کو چھوڑ کر جنگل اور ویرانوں میں بیٹھ جاؤ اور دنیا سے قطع تعلّق کر کے مجرّد زندگی بسر کرو۔ یہود کی عبادت یہ تھی کہ ہفتہ کے دن چھٹّی کی جائے اور اس دن کوئی کام نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ جب کبھی انہیں موقع ملتا بتوں کے سامنے سر جھکا لیتے عیسائیوں کی عبادت حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی تصویروں اور مجسموں کو پوجنا اور اپنے جسم کو سخت تکالیف پہنچانا تھا۔ انہوں نے اپنے جسم کو تکلیف پہنچانے کے بہت سے سخت قسم کے طریقے ایجاد کر لئے تھے اور اس کا نام انہوں نے عبادت رکھ لیا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ہستی سے تو واقف تھے مگر عبادت و پرستش کے مفہوم سے بالکل ناآشنا تھے۔ اسی طرح عرب کے باہر بھی خدائے واحد کی پرستش نہ تھی۔ یونانی اپنے بادشاہوں کے مجسموں اور ستاروں کے ہیکل کے پجاری تھے روم و ایشیا کوچک۔ یورپ، امریکہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت مریم و عیسیٰ علیہ السلام کی مورتیوں کو پوجا جاتا تھا۔ زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لیکر کابل و ترکستان تک اور چین سے جزائر ہند تک بودھ کی مورتیوں، سمادھوں اور ان کی جلی ہوئی ہڈیوں

سمادھوں اور

کی راکھ کی پوجا ہوتی تھی۔ چین کے کنفوشش اپنے باپ دادا کی مورتیوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج، گنگا اوزناروں کی عبادت ہوتی تھی۔ غرضکہ یہ تھا دنیا کے مذاہب اور اس کے پیرؤں کی عبادت کا مختصر نقشہ۔

ایسے وقت میں جب کہ دنیا پتھروں، درختوں، جانوروں، دیوتاؤں اور ستاروں کی پرستش کر رہی تھی اور ساری کائنات خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کو پوج رہی تھی۔ ایک بے آب وگیاہ ملک کے گوشہ سے یہ آواز آئی۔

یَاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ   اے لوگو اللہ واحد کی پرستش کرو۔

اسی ایک اکیلے خدا کی عبادت، عبادت ہے اور مخلوق کو پوجنا اور غیر اللہ کی پرستش کرنا عبادت نہیں جہالت ہے۔

معلوم ہے کہ یہ آواز دینے والا اور مخلوق کو خدائے واحد کی پرستش کی تلقین کرنے والا کون تھا؟ ہاں یہ وہی تھے جن کے متعلق عامر بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی تھی۔

وَاللّٰہِ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا   "قسم بخدا اگر آپ نہ ہوتے تو نہ ہم راستہ پاتے
وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا   نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔"

گویا اس شعر میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے احسان کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ آپ ہی کی تعلیم تھی جس نے نہ صرف اہلِ عرب کو بلکہ ساری کائنات کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا فرمایا۔ اگر آپ کی ذات ستودہ صفات نہ ہوتی تو آج سارے جہان کے انسانوں کی پیشانیاں غیر اللہ کے سامنے جھکی ہوئی ہوتیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو عبادت کا اصل مفہوم بتایا اور کائنات کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا اور خدا کے سامنے تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان فرما دیا۔

اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ   صرف ایک خدا کو پوجو اسی کو پوجنا اسی کی پرستش کرنا عبادت ہے۔

پھر آپ نے عبادت اور اس کا صحیح طریقہ پیش کیا اور بتایا عبادت کے لئے کسی خارجی رسم کی ضرورت نہیں ہے۔ آگ جلانا۔ مورتیوں کو سامنے رکھنا۔ لوبان اور خوشبو گھنٹوں اور ناقوسوں سے عبادت کو دلکش و دلفریب بنانا۔ ساز و ترنم اور جرس وغیرہ حتیٰ کہ کسی خاص لباس کی بھی قید نہیں ہے اور ان تمام غیر ضروری رسوم سے اسلام کی عبادت پاک ہے، اسلام کی عبادت کیلئے تو صرف پاک لباس جو ستر پوشی کر سکے، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے۔

مکان کی قید ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ چونے کی چار دیواری میں محدود کر دیا ہے۔ بُت خانوں سے باہر اور آتش کدوں سے الگ ان کے ہاں کوئی نماز نہیں ہے لیکن حضور علیہ السّلام نے دنیا کو بتایا کہ کائنات کا ہر حصہ معبد ہے اور زمین کا ہر گوشہ عبادت خانہ ہے، تم کہیں بھی ہو سمندر میں یا خشکی میں، ہوا میں یا زمین پر، ہنگامۂ کارزار میں یا ریل و جہاز میں، ہر جگہ خداوندِ قدّوس کی عبادت کر سکتے ہو۔

حضور نے فرمایا۔ اللہ نے مجھے بعض ایسی خصوصیتیں عطا فرمائی ہیں۔ جو پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں۔

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِداً   روئے زمین کو میرے لئے سجدہ گاہ بنایا گیا ہے۔

یعنی سمندر میں ہوا میں خشکی میں تری میں ہر جگہ مسلمان اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتا ہے اور کسی بھی عذرِ شرعی کی وجہ سے مسجد کے علاوہ بھی عبادت کر سکتا ہے۔ کیونکہ

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ   تم مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا۔

یعنی عرضِ حال کرنے کے لئے کسی بت کسی مجسّمہ کی ضرورت نہیں ہے تم جس مکان میں، زمین کے جس گوشہ میں رب کو پکارو گے وہ جواب دے گا۔

انسانی قربانی عبادت ہے؟ بعض مذاہب میں مرغوب عبادت یہ تھی کہ اپنے نفس یا اپنی اولاد کو آگ میں جلا دیا۔ دریا میں ڈبو دیا اور اس طرح خدا کے حضور تقرّب حاصل کیا جاتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"بے وقوفو! اس طرح اپنے آپ اور اپنی اولاد کو ہلاک کر دینا بھی کوئی عبادت ہے۔ جان دینی ہے تو سچائی کی حمایت میں کمزوروں کی مدد کے لئے دو۔ یہ عبادت ہے۔ اپنے ہاتھ سے خود کشی کرنا یہ عبادت نہیں ہے۔"

اسی طرح عام خیال تھا کہ اپنے نفس کو تکلیف دینا یہ بھی عبادت ہے، چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت عیسائیوں میں رہبانیت، ہندؤوں میں جوگیت اسی نظریہ کا نتیجہ تھا۔ یہ لوگ گوشت نہ کھاتے، ننگے رہتے، ایک سال تک کسی مقام پر کھڑے رہتے۔ اہل وعیال دُنیا کی نعمتوں کو چھوڑ کر تجرّد' رہبانیت اختیار کرتے اور اس کو بہت بڑی عبادت سمجھتے تھے، لیکن حضور رحمۃ للعٰلمین تشریف لائے اور آپ نے فرمایا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا "خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیتا"

مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ "اللہ نے تمہارے لئے دین میں تنگی نہیں کی ہے"

یعنی خدا رب العالمین ہے۔ ماں باپ سے زیادہ بندوں سے محبت فرماتا ہے وہ تمہاری ان مشقتوں سے خوش نہیں ہوتا اور نہ وہ ایسی بات کا حکم فرماتا ہے جو تمہاری وسعت قدرت اور اختیار میں نہ ہو۔ دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لینا اور ویرانوں میں جا کر تلاشِ حق کرنا عبادت نہیں ہے۔

لَا رَہۡبَانِیَّۃَ فِی الۡاِسۡلَامِ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔"

ہاں عبادت یہ ہے جس میں خالق ومخلوق دونوں کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے۔ عزیزوں رشتہ داروں سے نیک سلوک کرو۔ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرو، یتیموں غریبوں بیکسوں کی امداد کرو۔ حلال کی روزی کماؤ، دنیا کی نعمتوں سے لذّت حاصل کرو۔ عمدہ اور صاف کپڑے پہنو۔ اچھے اور پاک کھانے کھاؤ اور خدا کے حضور پانچ وقت حاضر ہو جاؤ اور اللہ کے حقوق بھی ادا کرو یہ ہی عبادت ہے اور یہ ہی انسان کا کمال ہے۔

اس مختصر سی تفصیل سے آپ پر ظاہر ہو گیا کہ اسلام نے جو عبادت کا مفہوم پیش کیا ہے وہ دراصل ایک فطری چیز ہے جس کو سلیم طبیعت فوراً قبول کر لیتی ہے۔

بہرحال عبادت کے لغوی معنی عاجزی کے ہیں۔ اور اصطلاح میں عبادت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا سمجھ کر اس کے حضور عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا اور اس کے احکام بجالانا یہ سمجھ کر کہ یہ حکم خدا کا ہے۔ انسان کیسا بھی اچھا کام کرے اگر اس سے مقصود خدا کی خوشی اور اس کی اطاعت نہ ہو تو وہ ہرگز عبادت نہیں ہے اور نہ ہی اسلام کی تعلیم ہے

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میری نماز میرا حج میری موت اور زندگی سب خدا کیلئے ہے

اس سے معلوم ہوا مسلمان جو بھی نیک کام کرے اگر اس سے مقصود خدا کے حکم کی بجا آوری اور اس کو خوش کرنا ہے تو وہ عبادت ہے چنانچہ اسی آیت کی جامع مانع تفسیر حضور کے اس ارشاد سے کی جاسکتی ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

عبادت میں اخلاص ضروری ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عبادت میں نیت اور اخلاص نہایت ضروری ہے۔ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خوشنودیِ خدا ہے عبادت ہے اور اگر اس کام سے مقصود شہرت اور نام وری ہے تو یہ عبادت نہ ہوگی کیونکہ جو عبادت خلوصِ نیت سے خالی ہو۔ اس میں تقویٰ کہاں ہوگا اور عبادت کی غرض و غایت تقویٰ بھی ہے

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے دل میں نیک کام کرنے کی امنگ اور برائیوں سے نفرت ہوتی ہے اور وہ کام خاص رب العزت جل مجدہٗ کی خوشنودی کیلئے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ یہ عبادت اس لئے ہے تاکہ تم متّقی بن جاؤ۔

عبادت کا وسیع مفہوم اسی حدیث "انما الاعمال" سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ صرف نماز حج زکوٰۃ ہی عبادت نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی رضا ہو وہ عبادت ہے مثلاً کسی شکستہ دل کی تسکین کیلئے تسلی و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ (الخ) اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔

اس آیت کی تشریح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ۔

كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ تَبَسُّمُكَ فِىْ وَجْهِ
ہر نیکی کا کام صدقہ ہے (بخاری) کسی بھائی کو دیکھ
اَخِيْكَ صَدَقَةٌ وَاِمَاطَةُ الْاِذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ
کر اس کو خوش کرنے کیلئے مسکرانا راستہ سے
صَدَقَةٌ اَلسَّاعِىْ عَلَى الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ
تکلیف دہ چیز کو ہٹانا بھی خیرات ہے، بیوہ غریب کی مدد کرنا
كَالْمُجَاهِدِ فِىْ سَبِيْلِ اللهِ
خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر ہے ۔

اسی طرح لوگوں کے درمیان بُغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا محبت پھیلانا بھی عبادت ہے چنانچہ ایک مرتبہ حضور نے فرمایا کیا تمہیں روزہ نماز سے بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں صحابہ نے عرض کی فرمائیے۔ یا رسول اللہ۔ فرمایا

اِصْلَاحُ ذَاتَ الْبَيْنِ ۔
آپس کے تعلقات کا درست رکھنا۔

ان مثالوں سے واضح ہُوا اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مومن کا ہر کام عبادت ہے۔ اس کا سونا جاگنا۔ کمانا۔ تجارت کرنا وغیرہ سب ہی عبادت ہیں جب کہ اس سے مقصود اللہ رب العزت جلّ مجدہٗ کی خوشنودی اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنا ہو۔

القرآن الحکیم

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ

قرآن حکیم وہ نسخۂ کیمیا ہے جو اللہ عزّ و جل نے زمانہ کی ہدایت کیلئے ہستی کے نقشِ اوّل اور بعثت میں سب سے آخر نبوت و رسالت کے تاجدار اور انبیاء و رسل کے سردار حضور سید الانبیا محمد مصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء پر نازل فرمایا۔ یہ قُرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وحیِ الٰہی ہے اور ساری کائنات کے لئے

آخری اور کامل و مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم و تلاوت کے متعلق حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۱) میں تم میں اللہ کی کتاب چھوڑ رہا ہوں جس میں نور اور ہدایت ہے۔
فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ (مسلم) تو اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔

(۲) وہ شخص جس کے سینہ میں قرآن نہ ہو وہ ویران مکان کی طرح ہے۔ (ترمذی)

(۳) اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ قرآن کا ماہر جنت میں رسلِ ملائکہ کے ساتھ ہوگا۔
الْبَرَرَةِ (بخاری)

(۴) خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ (بخاری) تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن پڑھے اور قرآن پڑھائے

(۵) حدیث ابو داؤد کا مضمون ہے کہ جس نے قرآن پڑھا تو قیامت کے دن اسکے والدین کو ایک تاج پہنایا جائیگا۔
ضَوْءُهٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ جس کی روشنی سورج کی روشنی سے اچھی ہوگی۔
اس کے بعد فرمایا جب قرآن کی تلاوت کرنے والے کا یہ رتبہ ہے
فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا تو تمہارا کیا خیال ہے اسکے متعلق جو قرآن پر عمل بھی کرے

اور حق یہ ہے کہ قرآن کے حفظ کرنے اور تلاوت کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ قرآنی ہدایات پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ قرآنی اصولوں کے جزئیات متعیّن ہوں اور اس کے ابہام و اجمال کی تبیین ہو جائے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارے لئے صرف قرآن ہی کافی ہے اور اس کی تفہیم کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں ہے، تو اگرچہ یہ جملہ بظاہر بہت ہی حسین ہے مگر حقیقت سے بہت ہی دور ہے۔ اگر محض کتابِ الٰہی ہدایت کے لئے کافی ہوتی تو کتاب کے ساتھ رسول کو مبعوث کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اور اللہ کی سنت بھی یہی ہے کہ اس نے جب کبھی بھی کتاب نازل فرمائی ہے تو کتاب کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث فرمایا ہے۔ زبور کا نزول ہوا تو اس کے ساتھ حضرت داؤد تشریف لائے توریت آئی تو جناب موسیٰ کلیم اللہ جلوہ گر ہوئے۔ انجیل نازل ہوئی تو حضرت مسیح کلمۃ اللہ مبعوث ہوئے علیہم السلام، اور خدا کی آخری کتاب قرآن آیا تو اس کے ساتھ آسمانِ نبوت کے نیرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلوہ گری ہوئی۔ ایسا تو ہوا ہے کہ اللہ عزوجل نے مخلوق کی ہدایت کے لئے صرف رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور اس کے ساتھ کتاب کو نہ اتارا ہو مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ صرف کتاب نازل کر دی گئی ہو اور اس کے ساتھ رسول نہ مبعوث ہوا ہو۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرضیِ الٰہی یہ ہے کہ حکم ہمارا ہو۔ ہمارے احکام کی تشریح تفصیل اور اصولوں کی تبیین اور جزئیات کی تعیین کا فرض زبانِ نبوت سے ادا ہو۔ چنانچہ خود قرآن نے بھی اس حقیقت کی مختلف اسلوب سے نشان دہی کی ہے ایک مقام پر فرمایا۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُو الرَّسُوْلَ — اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔

یہاں دو اطاعتوں کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ رسول کی اطاعت تو ممکن ہے مگر اللہ کی اطاعت کی عملی صورت بہرحال ناممکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس سے براہِ راست تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔ رہا قرآن تو بیشک وہ کلامِ الٰہی ہے مگر اس میں اصول ہیں۔ ابہام ہے اجمال ہے اور جب تک اس کے اصولوں کی تبیین اور جزئیات کی تعیین نہ ہو ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے تو قرآن نے اس گتھی کو یوں سلجھایا

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ — جس نے رسول کی اطاعت کی صرف اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ اللہ کی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اس کے رسول کے واسطہ سے کی جائے اطاعتِ الٰہی کیلئے اطاعتِ رسول شرط ہے کیونکہ اطاعتِ رسول کے بغیر اطاعتِ خدا ممکن ہی نہیں ہے۔ اب نتیجہ نکلا کہ قرآن کی تفہیم و ترجمانی کے لئے رسول کے اقوال و اعمال و کردار کی ضرورت ہے کیونکہ قرآن تو کتابِ صامت ہے اور رسول قرآنِ ناطق ہیں۔

جنابِ عائشہ صدیقہ عفیفہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال ہوا کہ حضور کا خُلق کیا تھا؟ آپ نے جواب دیا ۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن — حضور کا خلق تو قرآن تھا ۔

یعنی قرآن احکاماتِ ایزدی کا مجموعہ ہے اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عملی تصویر ہیں ۔ وہ متن ہے اور حضور اس کی تشریح ہیں چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں بجز ذاتِ نبوی اور کچھ نہیں ہے یعنی عبادات ہوں یا معاملات ایمانیات ہوں یا اخلاقیات سب کا ماخذ و مرکز ذاتِ نبوی ہی ہے حضور کے وسیلہ کو چھوڑ کر اور آپ کی سیرتِ پاک سے صرفِ نظر کر کے قرآن پاک کی تفہیم و ترجمانی ہو ہی نہیں سکتی ۔

وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر محض قرآن اُتار دیا جاتا اور اس کے ساتھ حضور مبعوث نہ ہوتے تو لوگ آیاتِ قرآنیہ کے معنیٰ میں اختلاف کرتے ۔ اصولوں کی جزئیات کے متعین کرنے میں لڑتے جھگڑتے اور کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا اور غلطی کی نشان دہی کرنے والا نہ ہوتا اور اس طرح اللہ کی کتاب جدال و نزاع کا اکھاڑہ بن کر رہ جاتی ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اس کا انتظام یوں فرمایا کہ قرآن کے ساتھ رسول کو مبعوث کیا تاکہ لوگ اپنے طور پر نہیں اپنی رائے اور اپنے قیاس سے نہیں بلکہ رسول کے بیان و شرح کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں خود قرآن مجید نے بھی قرآن کے ساتھ رسول کے اس تعلق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے ارشاد ہوتا ہے ۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل کیا تاکہ آپ خوب کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا

اپنے اسی منصب کو بیان کرتے ہوئے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

جو شخص قرآن کی تفسیر بغیر علم کے کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے ۔

حدیث ابوداؤد و احمد میں فرمایا:-

اَلْمِرَاءُ فِی الْقُرْاٰنِ کُفْرٌ — قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔

مَنْ قَالَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ بِرَاْیِہٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاءَ — جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی اور ٹھیک کی اس نے غلطی کی۔

ان احادیث میں یہ بتایا گیا کہ قرآن پاک کی تفہیم و ترجمانی کا حق صرف حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے محض اپنی ذاتی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کرنا اور اس میں جھگڑنا آدمی کو کفر تک پہنچا سکتا ہے۔ حتّٰی کہ اگر کسی نے اپنی ذاتی رائے سے قرآن پاک کی کسی آیت کا مفہوم و معنی ٹھیک ٹھیک ادا بھی کر دیا تو بھی اس نے غلطی کی۔ کیونکہ قرآن پاک کی تفہیم و ترجمانی میں انسان کی اپنی ذاتی رائے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن کی تفہیم و ترجمانی اور اس کے مفہوم و معنی کو متعیّن کرنے کا حق صرف اللہ کے رسول کو ہے لہٰذا قرآن کی صحیح تفسیر وہی ہے جو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل صحیح کے ساتھ مروی ہو۔

سیّد المتّقین امیر المومنین سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آیۃ وفاکھۃ وابا کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا۔

اَیُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِیْ وَاَیُّ اَرْضٍ تُقِلُّنِیْ اِذَا قُلْتُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ — کونسا آسمان سایہ فگن ہوگا اور کونسی زمین مجھے پناہ دیگی اگر میں اللہ کی کتاب کی بغیر علم کے تفسیر کروں۔ (خازن ج ۱ ص ۵)

آج قرآن پاک کی تفسیر و توضیح کے معاملہ میں بڑی دلیری دکھائی جاتی ہے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو قرآن کے الفاظ اور آیتوں پر ایسا ظلم ڈھا رہے ہیں جیسے قدیم زمانہ میں باطنی فرقے کے لوگ ڈھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام کے سامنے تو قرآن کا نام لیتے ہیں مگر کہتے وہ ہیں جو ان کے نفس کا تقاضا ہوتا ہے

ایسے ہی لوگوں کے متعلق زبانِ نبوۃ نے فرمایا :۔

”قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔“

ایسے لوگ اگر قرآن کو اپنی خواہشاتِ نفسانیہ کا تابع بنائیں تو تعجب ہی کیا ؛ مگر ستم یہ ہے کہ آجکل ہمارے بعض واعظ حضرات بھی محض مجمع کے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے قرآنی آیات کی تفسیر و معنیٰ کے بیان میں احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔

بہرحال ہمیں سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اللہ تعالےٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اخلاق و معاشرت

دینِ اسلام کے چار شُعبے ہیں۔ عقائد و عبادات معاملات اور اخلاقیات اور معاشرہ کی دینی و دُنیوی ترقّی و اصلاح میں ان چار شُعبوں کا بڑا ہی دخل ہے۔ معاشرت سے مراد رہن سہن کا وہ برتاؤ ہے جو ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جن سے کسی قسم کا تعلق و واسطہ پڑتا ہے خواہ یہ تعلّق مستقل اور دائمی ہو، جیسے ماں باپ، بھائی، بہن اولاد اور دوسرے عزیز و اقارب اور میاں بیوی یا گھر کے برابر رہنے والے پڑوسی کا اور خواہ عارضی اور وقتی ہو، جیسے سفر کے رفیقوں، مدرسہ، دفتر یا کارخانہ کے ساتھیوں کا۔ پھر آگے بڑھ کر حیوانات و جمادات سے بھی تعلّقات قائم ہوتے ہیں اور ان تعلّقات کے سبب انسان پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں انہی فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنے کا نام اخلاق ہے۔ معاشرہ کی اصلاح و ترقّی، خوش حالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے اسی دولت کی کمی کو حکومت اپنی قوّت و طاقت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاق و فرائض کو پوری طرح

ازخود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے اخلاق کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کیا ہے اور دینِ اسلام میں تو اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ جس ہستیِ مقدّس کو اللہ عزوجل نے ساری کائنات کی رہبری کے لئے مبعوث فرمایا۔ اس نے اپنے فرائضِ نبوّت میں سے ایک فرض یہ بتایا۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ

میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔

پھر یہی عالمِ تزکیہ فرمانے والے طیب وطاہر رسول جب نفلی نماز میں اپنی جبینِ نیاز کو بارگاہِ خداوندی میں جھکاتا ہے تو عرض کرتا ہے۔

وَاهْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَهْدِیْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَاتِهَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَاتِهَا اِلَّا اَنْتَ (مسلم)

الٰہی تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی فرما تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق سے مجھ کو پھیر دے اور انکو نہیں پھیر سکتا مگر تو۔

اگرچہ اعمالِ صالحہ میں عبادت کو جو مقام حاصل ہے وہ دین کے دوسرے اعمال کو نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقّی و تکمیل کی جو خاصیت عبادت میں ہے وہ کسی دوسرے اعمال میں نہیں ہے اور عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ شریعت کے دوسرے شُعبوں کے مقابل عبادت کو خصوصی مقام حاصل ہو کیونکہ عبد و معبود کا تعلّق دوسری تمام چیزوں کی نسبت عبادات سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور زندگی کے دوسرے شُعبوں کی اصلاح و درستی میں بھی عبادت کو خاص دخل ہے۔ لیکن عبادت کی یہ خصوصی اہمیت دین کے دوسرے شُعبوں اخلاق و معاشرت کی اہمیت کو کم نہیں کرتی بلکہ اور بڑھا دیتی ہے کیونکہ عبادات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی تاثیرات سے ایک اہم تاثیر انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت و تکمیل اور معاملات و معاشرت کی اصلاح بھی ہے قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ پر واضح کیا گیا ہے کہ

نماز بُری باتوں سے روکتی اور تقویٰ کی تعلیم دیتی ہے ۔ زکوٰۃ سراپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مُختلف حیثیتوں سے ہماری اخلاقی اصلاح وترقّی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے جس سے یہ بات کُھل جاتی ہے کہ اسلام کے چاروں ارکان نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کے پابند مسلمان کے لئے تو اخلاقِ حسن کو اختیار کرنا اور اپنے معاملات ومعاشرت کو درست رکھنا اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاقِ حسنہ کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے

اخلاقِ حسنہ | سورہ مومنون وفرقان کی حسب ذیل آیات پر غور کیجیے :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (مومنون)	بلاشبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے جو لغو بات پر دھیان نہیں دیتے ۔ جو زکوٰۃ ادا ۔ کرتے ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ۔
وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ فرقان	اور جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ دونوں کے بیچ میں رہیں ۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝	اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب بیہودہ پر گزرتے ہیں اپنی عزت سنبھالے گزر جاتے ہیں ۔

اِن آیات میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے ان میں وقار، تمکنت، ایفاءِ عہد - عفو ودرگزر - فیاضی - پاک دامنی - میانہ روی وغیرہ کو خاص رتبہ دیا گیا ہے اور یہ سب اخلاقِ حسنہ ہی کے سلسلہ کی چیزیں ہیں جن سے نہ صرف اخلاقِ حسنہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نماز روزہ کے پابند مسلمان کے لئے تو اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور رذائل اخلاق سے بیزاری کی ذمہ داری

بہ نسبت بے عملوں کے اور زیادہ ہے۔ اخلاقِ حسنہ کی اہمیت ہی کے سلسلہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا :۔

"جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھ سکے اس کی نماز ہی نہیں" (ابنِ کثیر سورہ عنکبوت)

روزہ کے متعلّق بھی اسی قسم کے الفاظ ارشاد فرمائے :۔

"روزہ رکھ کر بھی جو جھُوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" (بخاری)

یا آپ نے فرمایا :۔ لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمْ (بخاری)	اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرے گا جو اس کے بندوں کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا۔
اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمُ اللّٰہُ فِی السَّمَاءِ	تم زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم کرو۔ آسمان کا خالق تم پر رحم کرے گا۔
وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَایُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ (بخاری)	مجھے قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اسوقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چاہے جو وہ اپنے لئے پسند کرے۔
لَیْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ (مشکوٰۃ)	وہ مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی فاقہ میں رہے۔

اسی طرح حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض بُرے اخلاق کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ دوزخ میں لے جانے والے اور جنت سے محروم کرنے والے ہیں۔

لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ (مسلم) جسکے دل میں ذرہ برابر بھی تکبّر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائیگا۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ نَتَّاتٌ (بخاری)

جنت میں نہیں جائے گا چغل خور ۔

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ذَا الْوَجْہَیْنِ یَاْتِیْ ہٰؤُلَاءِ بِوَجْہٍ وَہٰؤُلَاءِ بِوَجْہٍ (بخاری)

قیامت کے دن سب سے بُرے حال میں وہ دورُخا آدمی ہوگا جو ایک گروہ سے ایک رُخ سے ملے اور دوسرے گروہ سے دوسرے رُخ سے ۔

اس مضمون کی اور بھی احادیث ہیں جن میں اخلاقِ حسنہ پر اسی انداز سے زور دیا گیا ہے کہ کہیں تو ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے اور کہیں دوزخ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور یہ بات صرف احادیث کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ قرآن مجید میں بھی یہی انداز موجود ہے ۔

اخلاقی امراض بخل ایک اخلاقی مرض ہے ۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا ۔

لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ہُوَ خَیْرًا لَّہُمْ بَلْ ہُوَ شَرٌّ لَّہُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ بِمَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔ (آل عمران)

کہ اللہ نے جن کو مال دیا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں اور جہاں اسکو خرچ کرنا چاہیئے وہاں خرچ نہیں کرتے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ان کے حق میں کوئی اچھی چیز ہے بلکہ وہ تو ان کے حق میں شرِ محض ہے ۔ قیامت کے دن یہی دولت انکے گلے کا طوق بنائی جائیگی ۔

نیز فرمایا : وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ

جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے ۔

یعنی بُخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ خود اپنے ساتھ بھی بُخل کرتا ہے اور وہ اسکی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے محروم کر دیتا ہے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے ۔

تو اگرچہ اچھے بُرے اخلاق کے اجزا کی قانونی حیثیت اور احادیث میں جو ایمان کی نفی آئی ہے اس کا صحیح مطلب و مفہوم تو قواعدِ شرعیہ کی روشنی ہی میں متعیّن ہوگا اور اس مختصر میں اس کی گنجائش بھی نہیں ۔

مگر بایں ہمہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ احادیثِ مذکورہ میں جن رذائلِ اخلاق کی موجودگی میں ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے اور جن بُرے اخلاق پر عذابِ جہنّم کی وعید سنائی گئی ہے یہ سب اخلاق ہی کے سلسلہ کی چیزیں ہیں اور ان سے دین میں اخلاق کی عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور انہی سے آج کے اچھے خاصے دیندار حلقوں کی اس غلط روش کی اصلاح بھی ہوجانی چاہیئے جن کی حالت نماز روزہ وغیرہ عبادات کے لحاظ سے تو غنیمت ہے مگر اخلاق ان کے بھی اسلامی نہیں۔ دین کے شُعبۂ عبادت کی اہمیّت تو کسی درجہ میں محسوس کی جاتی ہے مگر اخلاق و معاشرت کی اصلاح و درستی کا اتنا اہتمام نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے اور بعض ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نجات کیلئے صرف نماز روزہ ہی کافی ہے۔ رہی معاملہ کی درستگی اور اخلاق کی اصلاح تو یہ کوئی ایسی اہم چیز نہیں ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں اور کوئی چیز نہیں ہے لیکن ایمان کی تکمیل اور ایمان کے آثار کا ظہور بھی اخلاق ہی سے ہوتا ہے۔ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (ابوداؤد)	ایمان میں سب سے زیادہ کامل وہ مومنین ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہوں۔
اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ خُلُقٌ حَسَنٌ (ترمذی) ✓	قیامت کے دن مومن کی میزانِ اعمال میں سب سے زیادہ وزن دار چیز جو رکھی جائیگی وہ اس کا حُسنِ خُلق ہوگا۔
اَحَبُّ عِبَادِ اللّٰہِ اِلَی اللّٰہِ اَحْسَنُھُمْ اَخْلَاقًا (طبرانی)	اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔
اِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ وَاَقْرَبَکُمْ مِنِّیْ فِی الْاٰخِرَۃِ مَجْلِسًا مَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا وَاِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ فِی الْاٰخِرَۃِ	تم میں میرے سب سے زیادہ پیارے اور آخرت میں نشست میں مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں

مَسَاوِیْکُمْ اَخْلَاقًا۔ (بیہقی) مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔

ان روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق ہوتا ہے حُسنِ اخلاق میزان عمل کی ایک متاع گراں مایہ ہے۔۔ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے اخلاقِ حسنہ بھی ایک عظیم وجلیل نعمت ہے حُسنِ خُلق خدا کی محبت کا ذریعہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دنیا وآخرت میں قریب ہونیکا وسیلہ ہے حتیٰ کہ ایک حدیث میں فرمایا:۔

"انسان حُسنِ خُلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے"۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فرض عبادات کی ادائیگی کے بعد دن اور رات کو عبادت نفل میں نہیں گزار سکا۔ اور اس کا حُسنِ خُلق اچھا ہے اور وہ اخلاق حسنہ کو اختیار کئے ہوئے ہے تو نفل روزہ و نماز سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہی درجہ اخلاق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرت دستگیر نے فرمایا

- "جب تو جاہل، منافق اور طبیعت اور خواہش والے شیخ کی صحبت اختیار کرے گا تو وہ تیرے مقابلے پر نفس کا مددگار بنے گا، مشائخ کی صحبت دنیا کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ آخرت کیلئے کی جاتی ہے۔"
- "اسکی صحبت اختیار کر جو تیرے نفس کے جہاد پر تیری اعانت کرے نہ کہ اسکی جو تیرے مقابلے میں نفس کی اعانت کرے۔"
- "نہ کسی سے محبت کرنے میں جلدی کرو، نہ عداوت و نفرت میں، پہلے قرآن و حدیث کی کسوٹی پر اس کو پرکھ لو۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم نفس کی شرارت سے کسی پر بدگمانی کر بیٹھو کیونکہ یہ گناہ ہے۔"
- "جو شخص اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر رضا کا خواہاں ہو اس کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت موت کو یاد رکھے کیونکہ اس کا یاد رکھنا مصائب و آفات کو ہلکا کر دیتا ہے۔"

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والا جنتی ہے

صحابی ذی وقار جناب انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور رحمتِ عالم نورِ مجسم سیدالمرسلین خاتم النبیّین علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:۔

یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَفِیْ قَلْبِہٖ وَزْنُ شَعِیْرَۃٍ مِّنْ خَیْرٍ وَّیُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ فِیْ قَلْبِہٖ وَزْنُ بُرَّۃٍ مِّنْ خَیْرٍ وَّ یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ فِیْ قَلْبِہٖ وَزْنُ ذَرَّۃٍ مِّنْ خَیْرٍ

(بخاری)

حضرت انس سے مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ سے وہ سب لوگ نکالے جائیں گے جنہوں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا اور ان کے دل میں جَو کے دانہ کے برابر بھی خیر ہے پھر وہ لوگ بھی نکال لئے جائیں گے جنہوں نے لاالٰہ الا اللہ کہا اور انکے دل میں گیہوں کے دانے برابر بھی خیر ہے اور اسکے بعد وہ لوگ بھی نکال لئے جائیں گے جنہوں نے لاالٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہے۔

چار ذرّے رائی کے ایک دانہ کے برابر ہوتے ہیں۔ خوب یاد رکھیے کہ ذرّہ کے معنیٰ بعض لوگوں نے ایسے لفظوں سے لئے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ذرّہ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک ہوائی اور موہوم مقدار ہے جیسے بعض نے لکھا ہے کہ ذرہ جَو کے ایک ہزار چوبیسویں حصّہ کو کہتے ہیں لیکن درحقیقت ان تعبیرات سے ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ذرّہ شے کے قلیل و صغیر حصّہ کو کہتے ہیں یہ نہیں کہ اس کا تعیّن اور تصوّر اور مشاہدہ ذہن انسانی کے لئے ممکن ہی نہ ہو سوئی کی نوک مقابلۃً کتنی ہی صغیر ہے مگر ذہن و قلب کے لئے اس کے وجود کا احساس اور بصیرت کیلئے اس کا مشاہدہ ممکن ہے رائی کا دانہ خواہ کتنا ہی چھوٹا سہی مگر وجود کا ایک غیر مشکوک اور

ٹھوس تصور رکھتا ہے اسی طرح ذرہ ایک ہوائی مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ فافہم

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے نیز دیگر روایات میں مَا یَزِنُ ذَرَّۃً ۔ مِثقَالَ حَبَّۃٍ مِنَ الْخَیْرِ ۔ مَا یَزِنُ بُرَّۃً کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا۔ گیہوں کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا۔ رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اس کی بالآخر نجات ضرور ہوگی۔

جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا اسکی نجات ہوگی اس کا کیا مطلب ہے؟

واضح ہو کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جس کا کام ہی دین میں نت نئے فتنے اٹھانا اور آیات و احادیث کی تحریفِ معنوی کرنا ہے وہ اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب رائی کے دانے کے برابر ایمان بھی نجات کے لئے کافی ہے تو دنیا کی اکثر غیر مسلم قومیں بھی خدا اور آسمانی کتب اور بعض انبیاء و رسل پر ایمان رکھتی ہیں۔ اس ایمان میں اسلام کے بالمقابل کمی اور نقص ہی سہی لیکن رائی کے دانے سے تو یہ بہرحال کم نہیں ہے۔ لہٰذا ان سب کی نجات ہوگی اور ہر مذہب جس میں کم سے کم خدا پر ایمان کا وجود ہو آخر کار جنّتی بنا دینے کا ضامن ہے اور منکرین خدا کے سوا تمام انسان دوزخ سے نکال لئے جائیں گے مستشرقینِ یورپ سے متاثر ہونے والے مسلمان یا منکرینِ حدیث کی جماعت اگر اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالے اور وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے کا نعرہ بلند کرے تو کوئی حیرانی کی بات نہ تھی مگر حیرت یہ ہے کہ دیوبندی حضرات میں بھی ایسے لوگ ہیں جو مشرک اور اعلیٰ درجہ کے کافر کے لئے بھی بالآخر جہنم سے نجات پانے کا نظریہ رکھتے ہیں مثلاً سیرۃ النبیؐ جلد چہارم میں مولوی سلیمان ندوی دیوبندی نے اپنا مسلک یہ ہی لکھا ہے کہ کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہوگی اور وہ جنّت میں داخل کیا جائے گا۔

اگرچہ ندوی صاحب نے بالتّصریح "وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے" کا نعرہ بلند نہیں کیا مگر ان کے اس نظریہ کا نتیجہ و ثمرہ تو یہ ہی نکلے گا کہ ہر مذہب میں رہ کر نجات ہو سکتی ہے کیونکہ جب کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہو جائے گی اور انہیں انکے جرموں کی سزا دے کر جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔ تو پھر اسلام کا یہ دعویٰ تو ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا کہ نجات و مغفرت اور حصولِ فردوس کا واحد ذریعہ و وسیلہ صرف میں ہی ہوں۔

بہرحال اس مضمون کی احادیث سے مذکورہ بالا نتیجہ نکالنا بالکل غلط اور اسلام کے مُثلہ کرنے کے مترادف ہے، اور سخت قسم کی جاہلانہ تحریف ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم سے کسی بات کو اخذ کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ پورے قرآن شریف کی نصوص کو جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں پیشِ نظر رکھا جائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یا تو قرآن پاک میں تناقض و تصادم نظر آئے گا یا پھر متناقض و متصادم نظریئے اس سے اخذ ہوں گے۔ اسی لئے قرآن نے پورے قرآنِ پاک پر ایمان لانے کی تاکید کی ہے اور جو بعض آیاتِ قرآنیہ پر ایمان لائیں اور بعض آیات کو نظر انداز کر دیں تو ان کے لئے جہنم کی وعید سنائی۔ یہی حال سنتِ رسول اللہ کا ہے کہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی کسی ایک حدیث یا اسکے کسی ایک ٹکڑے سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لئے ہمیں دین سے متعلق حضور علیہ السلام کی عمومی تعلیم اور اس باب کی دیگر احادیث کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑے گا تب جاکر کہیں صحیح مفہوم و مطلب واضح ہوگا۔

کتاب و سنت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فلاح و فوز اُخروی کا ضامن صرف اسلام ہے اور اسلام نام ہے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی دعوت کو قبول کرنے کا۔ حضور علیہ السلام کی دینی دعوت کو قبول کرنیکا مطلب یہ ہے کہ دین و ایمان سے متعلق جو کچھ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے اسکی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا جائے مثلاً ایمان کے متعدد اجزا ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر وغیرہ وغیرہ تو ایمان کے تمام اجزائے ضروریہ پر ایمان لانے والا مومن ہے اور اس کے کسی ایک جز کا بھی انکار کرنے والا کافر ہے مثلاً ایک شخص اور تو سب کچھ مانے مگر ملائکہ کے مخلوقِ الٰہی ہونیکا منکر ہو۔ یا ایک شخص ملائکہ اور ایمان کے دوسرے اجزا کا تو قائل ہو مگر حضور علیہ السلام کے ختم الرسل ہونے کا انکار کرے تو ایسا شخص ایمان کے تمام اجزا پر ایمان رکھنے کے باوجود صرف اسکے ایک جز کے انکار کرنے کی وجہ سے بالاتفاق کافر قرار پائے گا اور نجات کا ہرگز ہرگز حقدار نہ ہوگا جب یہ قاعدہ ہمیں کتاب و سنت کی نصوصِ صریحہ سے معلوم ہوگیا تو اب وہ احادیث جن میں ایمان کے کسی ایک جز کا بیان ہوگا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دینی دعوت قبول کرنا اور تمام ضروریاتِ دین پر ایمان لانا مراد لیا جائے گا۔

زیرِ بحث حدیث ہی کو لیجئے اس میں صرف یہ ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھنے والا نجات پائے گا لیکن مُراد اس سے صرف توحید پر ایمان لانا نہیں بلکہ پورے کلمہ پر ایمان لانا ہے اور یہاں کلمہ کے جُزِ اوّل لا الٰہ الا اللہ کو جزِ ثانی محمد رسول اللہ کا علم قرار دیا گیا ہے جیسے کہتے ہیں کہ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ پڑھ تو اس سے مقصود صرف اتنے ہی لفظ نہیں بلکہ پوری سورۃ پڑھوانا منظور ہے۔ ایسے ہی یہاں توحید پر ایمان لانے سے مُراد رسالت پر ایمان لانا بھی ہے اور اللہ و رسول پر ایمان لانے کے بعد تو بلا ریب یہ طے ہو جاتا ہے کہ جو کچھ کتاب و سنّت سے ثابت ہو اس کا اقرار اور تصدیق کی جائے۔

یہی حال حدیثِ زیرِ بحث کے اس جملہ کا ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اس کی نجات ہوگی یعنی جس کے دل میں تمام ضروریاتِ دین تمام اجزاءِ دین کی نفسِ تصدیق پائی جائے گی اور اصل ایمان موجود ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بے عمل اور فاسق و فاجر کیوں نہ ہو اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے بعد بہر صورت جہنم سے نکال لیا جائیگا "ذرہ برابر ایمان ہوگا" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص اجزاء ایمان میں سے کسی جُز کا مُنکر ہوگا وہ بھی نجات پائے گا حدیث کے خط کشیدہ جملوں کو یہ مطلب پہنانا انتہائی درجہ کی جاہلانہ تحریف ہے اور اسلام سے کھلی ہوئی بغاوت ہے،

ایمان میں کمی یا ضُعف کا کیا مطلب ہے؛ خوب یاد رکھئے کہ ایمان کا ضُعف اور ایمان کا نقص یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں جس کے ایمان میں ضعف ہو وہ مومن ہے اور جس کے ایمان میں نقص ہو وہ یقیناً کافر ہے۔ نقص اور ضُعف کے اس فرق کو ایک مثال سے سمجھئے :-

ایمان کے متعدد اجزاء ہیں: توحید، رسالت، ملائکہ، آخرت، تقدیر، ان تمام اجزاء پر ایمان لانے والا اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرنے والا مسلمان ہے۔ اب جو شخص اجزاء ایمان میں سے کسی ایک جز کا بھی انکار کرے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائیگا کہ اس کا ایمان ضعیف ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس کا ایمان ناقص ہے، ادھورا ہے، ادھورے ایمان کو قرآن و سنّت اور اجماعِ امت کسی درجہ میں بھی ایمان نہیں مانتے بلکہ کفر و ارتداد قرار دیتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر صراحت کی کہ بعض پر ایمان اور بعض کی تکذیب ہے۔ اِس لئے تمام اجزاء ایمان پر ایمان لانے کے باوجود کسی ایک جز پر ایمان نہ لانے کا مطلب ہوگا "ذرہ برابر ایمان نہ لانا"۔ رائی کے دانہ کے

برابر بھی ایمان کا نہ ہونا" اور ایسا شخص جس کا ایمان ادھورا ہے بلاشبہ کافر ہے اور اسکی کسی صورت نجات ممکن نہیں ہے۔

اس کے برعکس" ایمان کا ضُعف" یہ ایک علیحدہ مفہوم رکھتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ پر ایمان ہو یعنی بلا استثنا ایمان کے تمام اجزائے ضروریہ کا اعتقاد ہو مگر اس تمام اجزائے ایمانی کے مجموعی اعتقاد کے یقین و اذعان میں ضعف ہو اس کو کمی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی ضُعف کے تناسب سے ایمان کی مقدار کا فیصلہ ہوگا۔

بعض وہ لوگ ہوں گے جنکے تمام اجزاءِ ایمانی کے مجموعی اعتقاد میں یقین و اذعان کا ضَعف بالکل ہوگا ہی نہیں بعض وہ ہوں گے جن کے اذعان و یقین میں ذرا سا ضُعف ہوگا اور بعض وہ ہوں گے جن میں یہ ضعف انتہا کو پہنچا ہوگا مگر اسکے باوجود تمام اجزائے ایمانیہ کے کسی جُزِ ایمان سے انکار و تکذیب کی نوبت نہیں پہنچی ہوگی تو ایسے افراد کو بھی مومن ہی مانا جائے اگرچہ یہ ضرور کہا جائے گا کہ ان کا ایمان کم ہے یا ان کا ایمان ضعیف ہے۔ اس کمی اور ضعف کے اظہار کیلئے احادیث میں رائی کے دانے یا ذرّے کی تمثیل دی گئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ایمان کا نقص یہ ہے کہ اجزائے ایمان میں سے کسی ایک کا بھی انکار و تکذیب کی جائے جنکے ایمان میں نقص ہوگا وہ کافر ہیں۔ ان کا ایمان ادھورا ہے۔ ظاہر ہے عیسائی یہودی اور دیگر مذاہب کے پیرو اگر توحید کے قائل ہوں بعض کُتُبِ سماویہ اور بعض انبیاء پر بھی ایمان رکھیں لیکن حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلامی کو قبول نہ کریں تو ان کے ایمان میں نقص ہے اور وہ کافر ہی قرار پائیں گے کسی حال میں بھی نجات نہ پائیں گے۔

اور ایمان کا ضُعف اور اسکی کمی کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ کا اِعتقاد ہے کسی ایک بھی جز کی تکذیب اور انکار نہیں ہے مگر اس مجموعی اعتقاد کے اذعان و یقین میں ضُعف ہے اور یہ ضُعف جب انتہا کو پہنچ جائے تب بھی ایسا شخص مومن ہے کیونکہ وہ اجزائے ایمانی میں سے کسی جز کا منکر نہیں ہے۔ ایسے ہی ضعیف الایمان افراد کے متعلق وحیِ نبوّت نے اعلان کیا کہ "جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنّم سے نجات پائے گا" فافہم

ضروری وضاحت واضح ہو کہ حدیثِ ہذا میں خیر سے مراد ہم نے ایمان لیا ہے جس کے چند وجوہ ہیں:۔

اوّل: یہ کہ حدیث کے لفظ یہ ہیں۔ وَكَانَ فِىْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَيْرِ۔ "قلبہ" کا قرینہ بتا رہا ہے کہ خَیر سے مراد ایمان ہے کیونکہ

ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری روایت میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر سے مُراد نورِ ایمان ہی لینا چاہیئے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں خیر کا لفظ آئے وہاں اس کے معنیٰ ایمان ہی کے لئے جائیں کیونکہ خیر کے لفظ سے جس طرح ایمان مراد لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عمل بھی مراد لے سکتے ہیں بلکہ بعض احادیث میں تو ایسے مقام بھی ہیں جہاں خیر سے ایمان مُراد لینا قطعاً حتماً غلط ہے چنانچہ بخاری و مسلم ہی میں یہ حدیث موجود ہے کہ جب سب لوگ سفارش کر چکیں تو اس کے بعد ارشاد باری ہوگا کہ فرشتوں کی، نبیوں کی اور مومنین کی سفارش ہو چکی اور ان کی سفارش قبول ہو گئی۔

اِلاَّ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ فَیَقْبِضُ قَبْضَۃً فَیُخْرِجُ مِنْھَا قَوْمًا مَّا لَمْ یَعْمَلُوْا خَیْرًا قَطُّ (بخاری و مسلم)

بس اب ارحم الراحمین ہی باقی ہے پھر اللہ تعالیٰ خود اپنی مغفرت و رحمت کے ہاتھ سے نکال لیگا۔ ان لوگوں کو جنہوں نے کبھی کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا۔

اس حدیث میں خیر سے مُراد عمل ہے ایمان نہیں اگر یہاں بھی خیر سے مراد ایمان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بھی بخش دیئے جائیں گے جن کے دل میں قطعاً ایمان ہوگا ہی نہیں حالانکہ یہ بات نصوصِ قرآن کے خلاف ہے پھر یَعْمَلُوْا کا لفظ بھی یہاں قرینہ ہے کہ خیر سے مراد یہاں عمل ہے نیز اس حدیث کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

ھٰٓؤُلَآءِ عُتَقَاءُ اللّٰہِ الَّذِیْنَ اَدْخَلَھُمُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ بِغَیْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْہُ وَلَا خَیْرٍ قَدَّمُوْہُ (بخاری و مسلم)

یہ لوگ ہیں اللہ کے آزاد کردہ اللہ نے ان کو جنت میں داخل فرمایا بغیر عمل کے جو انہوں نے کیا ہو اور بغیر خیر کے جو انہوں نے پیش کیا ہو۔

یہاں بھی خیر سے مُراد عمل ہی ہے یعنی یہ لوگ وہ ہوں گے جن کے پاس سوائے ایمان کے کوئی عمل صالح ہوگا ہی نہیں ان کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

اِسلام کی بُنیاد پانچ چیزوں پر ہے

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَہَادَۃُ اَنْ لَّآ
اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ
اِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءُ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ
وَصَوْمُ رَمَضَانَ

گواہی دینا اس بات کی کہ خدا کے سوا کوئی سچا معبود
نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول
ہیں اور نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا۔ حج کرنا اور رمضان
کے روزے رکھنا۔

(۱) بُنِیَ۔ بنی یبنی سے ہے اس کے معنیٰ بنیاد کے ہیں لفظ صَلاۃ سولہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل لغت میں اس کے معنے سرین ہلانے کے ہیں اور شریعت میں ارکانِ مخصوصہ کے یعنی نماز پڑھنا زکوٰۃ کے معنے پاکیزگی و طہارت کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی اس کے معنیٰ نشوونما کے بھی آتے ہیں جیسے کہتے ہیں زَکَی الزَّرْعُ یعنی کھیتی سرسبز و شاداب ہوگئی اور شریعت میں زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ سال گزر جانے پر صرف خدا کے لئے شارع کی مقرر کردہ مدوں اور مقداروں میں اپنے مال کا ایک حصّہ دینا۔ حج لغت میں قصد کرنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں حج کا مفہوم یہ ہے کہ مخصوص مکان کی طرف مخصوص وقت میں شارع کے مقرر کردہ نظام کے مُطابق قصد کرنا۔ صوم کے معنیٰ لغت میں رُکنے کے ہیں خواہ کسی بھی چیز سے رُک جایا کرے اور شریعت میں صوم کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان کا بہ نیتِ عبادت صُبح صادق سے غروبِ آفتاب تک اپنے آپ کو قصداً کھانے پینے اور جماع سے باز رکھنا۔ روزہ اور زکوٰۃ سنہ ۲ھ میں فرض ہوئے۔

(۲) اللہ عزّوجل کی طرف سے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستور ہمارے پاس آیا اس میں توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمدی کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حجِ بیت اللہ کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ نماز فرض ہے اسکی فرضیت کا مُنکر کافر ہے جو قصداً چھوڑے اگرچہ ایک ہی وقت کی ہو وہ فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو اسے قید کیا جائے یہاں تک کہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ ائمہ ثلاثہ حضرت امام مالکؒ و امام شافعی و امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک سلطانِ اسلام کو اس کے قتل کا حکم ہے۔ واضح ہو کہ ائمہ ثلاثہ تارکِ صلوٰۃ کے لئے قتل کا جو حکم دیتے ہیں تو یہ بطور تعزیر ہے۔ اس لئے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کافر ہے۔ بچہ کی سات برس کی عمر ہو تو اسکو

نماز پڑھنا سکھایا جائے اور جب دس برس کا ہو جائے تو مار کر پڑھوانا چاہیئے (ترمذی) زکوٰۃ بھی فرض ہے اس کا منکر کافر ہے اور نہ دینے والا فاسق اور قتل کا مستحق ہے اور ادا میں تاخیر کرنے والا گنہگار مردود الشہادۃ ہے ۔ روزہ بھی عین فرض ہے۔ اس کا منکر کافر ہے بلا عذر شرعی روزہ نہ رکھنے والا سخت گنہگار ہے اور عام طور پر کھلے بندوں روزے کا احترام نہ کرنے والا مستحقِ تعزیر ہے۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا اس کی فرضیت بھی قطعی ہے، اس کا منکر بھی کافر ہے۔ عمر بھر میں حج صرف ایک بار فرض ہے۔

(۳) ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں سے کسی کا بھی تارک مسلم نہیں ہے لیکن اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا محض تارک کافر نہیں ہوتا جب تک کہ انکی فرضیت کا انکار نہ کر دے چنانچہ وہ حدیث جس کا مضمون یہ ہے کہ جس نے قصداً نماز ترک کی وہ کافر ہے، یہ وعید زجر و توبیخ پر محمول ہے یا اس سے مراد کفرانِ نعمت ہے یا یہ حدیث مؤوّل ہے یعنی معنیٰ حدیث یہ ہے کہ جو شخص ان کے ترک کو حلال جانے وہ کافر ہے۔

(عینی جلد ۱ صـ ۱۴۲)

(۴) ارکانِ اسلام کے پانچ امور میں بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عبادت یا قولی ہوگی تو یہ شہادت ہے یعنی توحید و رسالت پر ایمان لانا یا غیر قولی ہوگی اس کی دو صورتیں ہیں ترکی ہوگی تو یہ روزہ ہے فعلی ہوگی تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں بدنی ہوگی تو یہ نماز ہے یا مالی ہوگی تو زکوٰۃ ہے یا مالی اور بدنی دونوں سے مرکّب ہوگی تو یہ حج ہے ۔

(۵) ان ارکانِ اسلام میں رُکنِ اصلی صرف ایمان ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا دار و مدار بھی ایمان پر ہے اور یہاں نماز روزہ کو رکنِ اصلی کے ساتھ صرف اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ اعظم شعائرِ اسلام ہیں ۔

(۶) اس حدیث میں ایمان بالانبیاء و کتب سماویہ ملائکہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کرنا تو اس میں تمام عقائدِ اسلامیہ آگئے۔ گو اس حدیث میں عقائد اسلامیہ کی تفصیل نہیں ہے اور دوسری حدیثوں میں عقائدِ اسلامیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

علم و عرفان

راہِ حق میں مصائب حق کی اشاعت و تبلیغ میں دوام و تسلسل ہونا چاہیئے اور جو پروگرام بنایا جائے اسے استقلال اور ذمہ داری سے برابر چلاتے رہنا چاہیئے۔ حضور علیہ السّلام کا ارشاد ہے:۔

"بہترین عمل وہ ہے جو مسلسل کیا جاتا رہے خواہ وہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔" (بخاری)

حق پر چلنے اور حق کی دعوت دینے کی راہ میں مصائب و آلام سے دوچار ہونا بھی لازمی و لابدی ہے۔ اسی لئے راہِ حق میں پیش آنے والی تکالیف کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور صبر و استقامت کی ہدایت۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ نیکی کا حکم دو۔ برائی سے روکو اور اس راہ میں
اصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ (لقمٰن) جو مصائب بھی آئیں ان پر صبر کرو۔

اِس آیت سے واضح ہوا کہ اس راہ کے مسافر کو منازلِ آزمائش سے گذرنا ناگزیر ہے اور کامیاب وہی ہے، جو صبر و تحمل اور استقامت کا دامن تھامے رکھے اور کانٹوں کے نشتروں کو برداشت کرتا ہے۔ آزمائش کی منزلوں سے گذر کر ایمان میں قوت و حرارت اور اخلاق و کردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے —— خدا اپنے مخلص بندوں کو ضرور آزماتا ہے اور جو دین و ایمان میں جتنا پختہ اور راسخ ہوتا ہے اسکی آزمائش بھی اسی لحاظ سے سخت ہوتی ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ
الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا
إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ٥ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ
رَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ٥ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں
اور جانوں اور پھلوں کی کمی اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو کہ
جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں گے ہم اللہ کے مال
ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب
کی درودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحضور نبوی عرض کی یا رسول اللہ سب سے زیادہ سخت آزمائش کس شخص کی ہوتی ہے۔ فرمایا انبیاء کی، پھر جو دین و ایمان میں انبیاء سے زیادہ قریب ہو پھر جو اس سے قریب ہو آدمی کی آزمائش

اسکے دین کے اعتبار سے ہوتی ہے جو شخص اپنے دین میں پختہ ہوتا ہے اسکی آزمائش سخت ہوتی ہے اور جو کمزور ہو اسکی آزمائش اسی اعتبار سے ہلکی ہوتی ہے۔ یہ آزمائش جاری رہتی ہے حتی کہ وہ شخص زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر گناہ کا کوئی اثر نہیں رہ جاتا ——— "مجھے قسم ہے اس ہستیِ مقدس کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے مجھے راہ خدا میں اتنا ستایا اور ڈرایا گیا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اتنا ستایا اور ڈرایا نہیں گیا ہم پر تیس تیس شب و روز ایسے گذرے ہیں کہ میرے اور بلال کے کھانے کیلئے کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے سوا اس مختصر توشہ کے جو بلال کی بغل میں تھا۔" (ترمذی)

خدمتِ خلق کسی مسلمان بھائی کی حاجت و ضرورت کو پورا کر دینے کے ثواب اور اجر کے متعلق حضور سیّدِ عالم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَاللّٰهُ فِیْ عَوْنِ عَبْدِهٖ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ۔ (ترمذی) اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جبتک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی (جائز) مدد میں رہتا ہے

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جب کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے تم اس کی مجھ سے سفارش کرو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔ نیز فرمایا کسی بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی)

طہارت و پاکیزگی یعنی دل کو عقائد باطلہ و خیالات فاسدہ سے پاک و صاف رکھنا، کپڑوں، مکان اور ماحول کی ظاہری نظافت و طہارت کا اہتمام کرنا اور ہر معاملہ میں صفائی و ستھرائی کو اختیار کرنا شاخہائے ایمان سے ہے۔

حضور سیّدِ عالم نورِ مجسّم نے فرمایا:۔

اَلطَّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ (مسلم) پاکیزگی نصف ایمان ہے۔

لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةً بِغَیْرِ طُهُوْرٍ (مسلم) بغیر طہارت کے اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتا۔

لَا یُحَافِظُ عَلَی الْوُضُوْءِ اِلَّا مُؤْمِنٌ (ابن ماجہ) مومن ہی وضو پر محافظت کرتا ہے۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پاکیزگی و طہارت پر قائم رہتے تھے اور اسی کی صحابہ کرام کو تلقین فرماتے تھے جنابِ بلال رضی اللہ عنہ سے حضور نے سوال کیا۔

"تم کونسا بہترین عمل کرتے ہو جب میں جنت میں گیا تو
اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی آہٹ سنی۔"

حضرت بلال نے عرض کی۔ یا رسول اللہ سب سے بہتر جو میں کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میرا وضو جاتا رہتا ہے تو فوراً کر لیتا ہوں اور اسکے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھتا ہوں ــ حضور نے فرمایا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام عطا فرمایا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

اسلام کیا ہے؟

جنابِ ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز حضورِ اکرم نورِ مجسم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما تھے کہ ایک شخص حاضرِ دربار ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ایمان کیا ہے؟ حضور نے جواب دیا۔

اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَ
وَبِلِقَآئِہٖ وَرُسُلِہٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ قَالَ
مَاالْاِسْلَامُ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ
وَلَا تُشْرِکَ بِہٖ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ وَتُؤَدِّیَ
الزَّکٰوۃَ الْمَفْرُوْضَۃَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ
قَالَ مَاالْاِحْسَانُ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ
کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ
یَرَاکَ قَالَ مَتَی السَّاعَۃُ قَالَ مَاالْمَسْئُوْلُ
عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّآئِلِ وَسَاُخْبِرُکَ
عَنْ اَشْرَاطِھَا اِذَا وَلَدَتِ الْاَمَۃُ
رَبَّھَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاۃُ الْاِبِلِ
الْبُھْمِ فِی الْبُنْیَانِ فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ
اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ

ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اس کے ملائک پر، اللہ تعالیٰ کی لقاء پر، اس کے رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان رکھے اس نے سوال کیا اسلام کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کہ تو خاص اللہ کی عبادت کرے۔ اس کا کسی کو شریک نہ بناوے نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اس نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس طرح گویا کہ تو اسکو دیکھ رہا ہے پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے پھر اس نے سوال کیا قیامت کب آئے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس سے قیامت کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں تجھ کو قیامت کی نشانیاں بتاتا ہوں (جو یہ ہیں) جب کہ عورت اپنے

الْاٰيَةَ ثُمَّ اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِيْلُ جَآءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِيْنَهُمْ (بخاری)

سردار کو جنے اور جب سیاہ اونٹ چرانے والے بڑی بڑی عمارتوں میں رہیں (اور تفاخر و تکبر کا اظہار کرنے لگیں) اور پانچ امور ہیں جن کو (بالذات) کوئی نہیں جانتا سوائے خدا کے۔ پھر حضور علیہ السلام نے آیت اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پڑھی (جس میں امور خمسہ قیامت وغیرہ کا ذکر ہے) پھر وہ سائل واپس ہوا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اس کو بلا لاؤ تو صحابہ کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس پر حضور نے فرمایا یہ جبریل تھے لوگوں کو ان کا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔

اس حدیث کو علماء محدثین نے اُمُّ السنّہ بھی کہا ہے گویا جس طرح قرآن مجید کے تمام اہم مطالب و مضامین پر بالاجمال حاوی ہونے کی وجہ سے سورہ فاتحہ کا نام اُمُّ الکتاب ہے اس طرح یہ حدیث بھی اپنی جامعیت کی وجہ سے اُمُّ السنّہ کہے جانے کی مستحق ہے۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے امام مسلم نے مسلم کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے اور امام بغوی نے اپنی دونوں تالیفوں مصابیح اور شرح السنۃ کا آغاز اسی مضمون کی حدیث سے کیا ہے۔ علامہ قاضی عیاض نے فرمایا یہ حدیث تمام وظائف و عباداتِ ظاہریہ و باطنیہ کو حاوی ہے۔ حتّٰی کہ تمام شریعت کے علوم کا ماخذ ہے۔ امام بخاری نے تفسیر اور زکوٰۃ میں بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ مسلم نے ایمان میں، ابن ماجہ نے سنن و فتن میں، ابوداؤد نے سنّت میں اور نسائی نے ایمان میں۔ ترمذی۔ احمد۔ بزار ابن عوانہ وغیرہم محدّثین نے بھی اس حدیث کو اپنے مصنّف میں ذکر کیا ہے۔

(۲) بارزاً کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً تو زمین کو ظاہر دیکھے گا یعنی اس پر کوئی سایہ وغیرہ نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ حضور علیہ السلام بھی ایک دن مجمع صحابہ میں ظاہر ہوئے فَاَتَاهُ رَجُلٌ۔ رجل سے مراد جبریل ہیں جو بصورتِ رجل آئے ملائکہ کی جمع ملاٹک ہے۔ اصل اس کی مَلْاَكٌ ہے مَفْعَلٌ کے وزن پر۔ ملائکہ اجسامِ نوری ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دی ہے کہ جو شکل چاہیں بن جائیں

وَرُسُلِہٖ یہ جمع ہے رسول کی۔ رسول وہ ہے جس پر کتاب نازل ہوئی یا فرشتہ اترا ہو۔ اور نبی وہ ہے جس پر کتاب یا فرشتہ نازل نہ ہوا ہو۔ اس لحاظ سے ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں بِالْبَعْثِ اس سے مراد قبروں سے اُٹھنا یعنی مرنے کے بعد زندہ کیا جانا ہے تَعْبُدَ اللّٰہَ عبادت غایتِ خضوع اور انتہائے تذلل کو کہتے ہیں اور اس میں یہ شرط ہے کہ جس کی عبادت کی جائے اس کی الوہیّت کا اعتقاد بھی ہو۔ اَللّٰہُ رب العزت جل مجدہ کا علمِ ذاتی ہے جس میں شرکت نہیں ہوتی۔ اللہ وہ ذاتِ مقدّس ہے جو واجب الوجود ہے مُتصرّف بالذاتِ ہے۔ تمام خوبیوں کا جامع اور عیبوں سے پاک ہے اور ساری کائنات کا خالق و رازق ہے۔ خدا کی اطاعت کو عبادت کہتے ہیں۔ اِحسان کے لغوی معنی نیکی کے ہیں یہ ضد ہے برائی کی۔ اَشراط۔ یہ شرط کی جمع ہے اس کے معنی علامت (نشانی) کے ہیں رب کے معنی مالک، سردار، تربیت دینے والا۔ پالنے والا (مُربّی و مُصلح) کے آتے ہیں۔ یہ اللہ عزوجل کی صفت بھی ہے جب بغیر اضافت کے رب کا لفظ بولا جائے تو اس سے مُراد اللہ عزّوجلّ ہوتا ہے اور اضافت کے ساتھ غیر اللہ پر بھی اس لفظ کا استعمال جائز ہے جیسے اسی حدیث میں ربّ بمعنی سردار آیا ہے یا جیسے ماں باپ کو رب کہتے ہیں کیونکہ وہ بچہ کی تربیت کرتے ہیں۔ گھر کے مالک کو۔ آقا کو۔ حاکم کو بھی رب کہتے ہیں۔ بہرحال غیر اللہ پر اس کا اطلاق اضافت کے بغیر کرنا جائز نہیں ہے۔

اِذَا تَطَاوَلَ کے معنی فخر و تکبّر کے ہیں یعنی یہ قیامت کی علامت ہے کہ ذلیل اور کمینے لوگ اونچے اونچے محلوں میں رہیں اور تکبّر و غرور کریں بُہْمٌ ب کے پیش کے ساتھ وہ چیز جو بالکل سیاہ ہو۔

ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کا بیان حدیث ہذا میں ایمان، اسلام، احسان، قیامت اور اس کی علامات کا ذکر ہے۔ ایمانیات میں ایمان باللہ، ملائکہ، انبیاءِ کرام، لقاءِ الٰہی اور بعث کا ذکر ہے اور اسلام میں عبادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ کا ذکر ہے۔ یہ حدیث دراصل مُختصر ہے۔ مفصل میں ایمانیات میں کُتبِ سماویہ روزِ قیامت اور خیر و شر کی تقدیر کا بھی ذکر ہے اور اسلام میں حجِ بیت اللہ اور توحیدِ خداوندی و رسالتِ محمّدی کا بھی ذکر ہے۔

ایمان کے معنیٰ ایمان کے اصل معنیٰ کسی اعتبار و اعتماد پر کسی بات کو سچ ماننے کے ہیں، کما فی القرآن: وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ (سورہ یوسف ع ۳) لیکن اصطلاحِ شرع میں ایمان یہ ہے کہ جو علم اور ہدایت اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائیں اس کی تصدیق کرنا اور انکو حق جان کر قبول کرنا پیغمبر کی اس قسم کی کسی بات کو نہ ماننا ہی اس کی تکذیب ہے جو انسان کو کافر کردیتی ہے، لہٰذا مومن ہونے کیلئے ضروری ہے كُلُّ مَا جَاءَ بِهِ الرَّسُوْلُ مِنْ عِنْدِ اللهِ ان تمام چیزوں اور حقیقتوں کی جو اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائے تصدیق کی جائے لیکن ان سب چیزوں کی پوری تفصیل معلوم ہونی ضروری نہیں ہے یعنی ایمانیات سے متعلق حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر تشریح خود فرمادی ہے اس کو اسی قدر تشریح کے ساتھ ماننا ضروری ہے اور ایمان کی جن باتوں کو حضور علیہ السلام نے مجمل رکھا ہے ان کو اسی اجمال کے ساتھ ماننا کافی ہے۔ غرضکہ جن امور کا ثبوت حضور علیہ السلام سے ایسے قطعی و بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ دین کی ایسی باتوں کو اصطلاحِ شرع میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے اگر ان میں سے کسی کا انکار کرے مومن نہیں رہے گا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایمان کی جو ضروری باتیں بیان فرمائی ہیں قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ان کا اسی تشریح و تعین کے ساتھ بیان آیا ہے مثلاً سورۂ بقر کے رکوع ۱ و ۲۲ و ۴۰ میں اور سورہ نساء کے رکوع ۲۰ میں۔

ایمان باللہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے موجود وحدہٗ لاشریک خالقِ کائنات متصرفِ موجودات اور رب العالمین ہونے پر یقین کیا جائے، عیب و نقص کی ہر بات سے پاک اور ہر صفتِ کمال سے اس کو متصف سمجھا جائے اور اس کی تمام صفات علم و قدرۃ ارادہ کلام، سمع و بصر و حیات پر ایمان لایا جائے۔

ایمان بالملائکہ: فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات میں ایک مستقل

نوع کی حیثیت سے ان کے وجود کو حق مانا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ و محترم مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (انبیاء ع ۱۲)۔ جن میں شر، شرارت، عصیان اور بغاوت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک ہیں۔ اللہ کے حکم کے خلاف نہ بھول کر کچھ کرتے ہیں اور نہ قصداً۔ ان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم ع ۲) فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت۔ ان کو قدیم ماننا یا ان کی ادنیٰ توہین کرنا، یا ان کے وجود سے انکار کرنا یا یہ کہنا کہ نیکی کی قوت فرشتہ ہے یہ سب باتیں کفر ہیں۔ فرشتوں کے متعلّق مختلف فرائض ہیں جو بحکمِ الٰہی ادا کرتے ہیں مثلاً پانی برسانا۔ جان نکالنا۔ ماں کے پیٹ میں بچّہ کی صورت بنانا وغیرہ وغیرہ۔

قُرآنِ حکیم نے فرشتوں کے فرائض اور ان کی صفات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے بعض آیاتِ قرآنیہ کا خلاصہ ہم یہاں ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان پیام رسانی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ الحج ع ۱۰

۲۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام پر وحی لانے کی خدمت بھی انہی کے سپرد ہے۔ شوریٰ ع ۵

۳۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اترتے ہیں حضرت زکریا و مریم کو بشارت دینے کے لئے اور حضرت لُوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لے کر آئے۔ مریم ع ۲ و ہود ع ۷

۴۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی و نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو لکھتے ہیں۔ انفطار ع ۱، رعد ع ۲، انعام ع ۸، ق ع ۲،

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کے مُطابق ان پر خدا تعالیٰ کی رحمت یا لعنت لے کر نازل ہوتے ہیں۔ انبیاء ع ۷، الصّٰفّٰت ع ۴، شوریٰ ۱۔

۶۔ اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں اور مومنوں کیلئے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ آل عمران ع ۹ بقرہ ع ۱۹

۷۔ جنت و دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیرِ اہتمام ہوگا زمر ع ۸، رعد ع ۳، مدثر ع ۱

۸۔ قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل ہوں گے حاقہ ع ۱، انبیا ع ۲،

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں اور بحکمِ الٰہی پوری مملکتِ الٰہیہ میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کرتے ہیں۔

شوریٰ ع ۱۔ والمدبرات امراً ۱۰

قرآنِ حکیم کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے انسانوں اور جنوں سے ایک علیحدہ مستقل مخلوق ہیں چنانچہ ملائکہ کے وجود پر اور اس پر کہ وہ ذواتِ قائمہ بانفسہا ہیں تمام عقلا کا بھی اتفاق ہے البتہ ان کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک یہ نفوسِ ناطقہ کے علاوہ جواہر مجردہ قائمہ بانفسہا ہیں۔ نصاریٰ کی ایک جماعت انہیں نفوسِ بشریہ مفارقہ بتاتی ہے۔ اکثر اہلِ اسلام کے نزدیک ملائکہ اجسامِ لطیفہ نورانیہ ہیں۔ ایک فرمانبردار معصوم مخلوق ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اشکالِ مختلفہ و صورِ متفاوتہ میں متشکل و ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔

ملائکہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب جو لوگ وجودِ ملائکہ کے منکر ہیں یا اس کو وہمی یا خیالی چیز سمجھتے ہیں وہ ان کے عدمِ وجود پر سب سے اہم دلیل صرف یہ دیتے ہیں کہ اگر وہ موجود ہوتے تو نظر آتے لیکن یہ سخت جاہلانہ شبہ ہے۔ دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن وہ نظر نہیں آتیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب کہ خوردبین کی ایجاد نہیں ہوئی تھی ہوا، پانی، خون کے قطرہ میں جراثیم کیا کسی نے دیکھے تھے، لیکن آج خوردبین کے ذریعہ ہر آنکھ والا ان جراثیم کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح رُوح کو لیجئے۔ کیا یہ نظر آتی ہے اور کیا اقلیمِ بدن میں جو چیز جان کے نام سے موسوم ہے اور جس کے وجود کو ایک دہریہ بھی تسلیم کرتا ہے کسی آلہ سے دیکھی جا سکتی ہے؟ تو جیسے ہماری آنکھیں خود اپنی رُوح یا جان کو دیکھنے سے عاجز ہیں اسی طرح وہ فرشتوں کے دیکھنے سے بھی قاصر ہیں اس لئے یہ کہنا کہ جو چیز نظر نہ آسکے اس کا کوئی وجود ہی نہیں سخت جاہلانہ خیال ہے۔

لقاءِ الٰہی پر ایمان | لقاءِ الٰہی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ آخرت میں اللہ عزّ و جل کا دیدار ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے لقاءِ الٰہی کو مومن کے لئے بہترین نعمت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا

کہ جو شخص آخرت میں دیدارِ باری تعالیٰ کی تمنّا رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ عملِ صالح کو اختیار کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

غرضکہ یہ یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور آخرت میں نیک بندوں کو اللہ کا دیدار ہوگا یہ بھی ایمانیات میں داخل ہے۔

ایمان بالرُّسل | رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ اللہ عزّ و جل نے مخلوق کی ہدایت کے لئے جس قدر انبیاء و مُرسلین مبعوث فرمائے وہ سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور پیغمبر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا وہ حق ہے اور انہوں نے اپنے فرضِ نبوّت کو کما حقّہٗ ادا فرمایا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ ع ۴۰)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لایا۔ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

نیز سورہ نساء کے رکوع ۲۰ میں فرمایا۔ جس نے خدا کا اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔ نیز سورہ نساء کے رکوع ۲۱ میں فرمایا۔ کہ ماننے کے معاملے میں خدا اور رسول میں کچھ فرق نہیں ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ وہ یقیناً کافر ہیں گو یہ عقیدہ صرف

اور صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس میں مومن ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء کی نبوّت و رسالت کی تصدیق کی جائے۔ اس کے برعکس دنیا کے کسی مذہب میں یہ بات نہیں ہے چنانچہ ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ہے۔ ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے۔ ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر، چنڈال، ناپاک وغیرہ کہہ کر بھی ہندو رہ سکتا ہے لیکن حضور سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا کہ کوئی ان کی پیروی کے دعویٰ کے ساتھ ان سے پہلے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ غرضکہ اسلام میں تمام پیغمبروں کی نبوّت کی تصدیق کرنا اور ان کا پورا احترام کرنا ایمانیات میں داخل ہے، پھر نبوّت و رسالت کے متعلّق مندرجہ ذیل امور کو ماننا بھی ضروری ہے:-

(۱) ہر نبی مستقل طور پر نبی ہے۔ نبوّت کی کوئی قسم نہیں تمام انبیاءِ کرام نفسِ نبوّت میں برابر ہیں۔ کسی نبی کی نبوّت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا ظِل یا عکس یا پرتو نہیں اور نہ یہ کہ حضور علیہ السلام کی نبوّت قدیم ہے اور باقی کی حادث۔ (۲) نفسِ نبوّت میں گو تمام انبیاءِ کرام برابر ہیں مگر مرتبہ و مقام میں فرق ضرور ہے۔ ہمارے حضور علیہ السّلام تمام انبیاء کے سردار امام المرسلین اور خاتم النّبیین ہیں اور آپ کا درجہ تمام انبیاء علیہم السلام سے بلند و بالا ہے (۳) حضرت آدم علیہ السّلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک نبوّت کا سلسلہ جاری رہا اور حضورِ اکرم آخری نبی ہیں آپ پر نبوّت و رسالت کو ختم کر دیا گیا اور دین کامل ہو گیا۔ اب قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے نجات و فلاح صرف آپ ہی کے اتّباع اور آپ کی ہی ہدایات کی پیروی میں ہے (۴) انبیاءِ کرام کے خصائص و فضائل و معجزات کو ماننا بھی ضروری ہے اور ان کی تعظیم فرضِ عین بلکہ تمام فرائض کی اصل ہے، ان کی ادنیٰ توہین کفر و ارتداد ہے (۵) انبیاءِ کرام چھوٹے بڑے گناہ سے قبلِ نبوّت و بعدِ نبوّت پاک ہیں اور تمام انبیاء معصوم ہیں (۶) انبیاءِ کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ایک آن کے لئے ان پر وعدۂ الٰہی کے مطابق موت

آئی پھر زندہ ہو گئے۔ ان کی زندگی شہیدوں کی زندگی سے بڑھ کر ہے (تکمیل الایمان شیخ عبد الحق محدث دہلوی) (۷) اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو غیوب پر مُطّلع کیا خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیوب کثیرہ وافرہ کا عالم بنایا اور زمین و آسمان کا ہر ذرّہ آپ کے پیش کر دیا (حدیث طبرانی) (۸) ہمارے حضور افضل الخلق اور اللہ عزّ وجل کے نائبِ مطلق ہیں۔ آپ تمام انبیاء علیہم السلام کے نبی ہیں اور تمام جہان میں کوئی کسی خوبی میں حضور علیہ السّلام کے برابر نہیں ہو سکتا۔ آپ اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کے قاسم ہیں۔ آپ کو مرتبہ معراج عطا ہُوا حضور علیہ السّلام نے بچشمِ خود ربّ العزت جلّ مجدہٗ کے دیدار کا شرف حاصل کیا اور عرش و فرش کے تمام عجائب و غرائب کا شبِ معراج مشاہدہ فرمایا۔

نوٹ: یہ چند ضروری باتیں یہاں لکھ دی ہیں، عقائد کی تفصیل کیلئے بہارِ شریعت حصہ اوّل کا مُطالعہ کیجئے۔

اسلام کے معانی اور اس کی حقیقت جب حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ایمانیات کو بیان فرما چکے تو پھر سائل نے آپ سے اسلام کے متعلق سوال کیا۔ واضح ہو کہ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کو کسی کے سپرد کر دینا اور بالکل اسی کے تابعِ فرمان ہو جانا۔ انبیاء کرام کے لائے ہوئے دین کو اسلام اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں بندہ اپنے کو بالکل اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کی مکمّل اطاعت کو اپنی زندگی کا دستور بنا لیتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:۔

(۱) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا (ج ع ۵)	"تمہارا اللہ وہی الٰہ واحد ہے لہٰذا تم اسی کے مطیع (مسلم) ہو جاؤ۔
(۲) وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ (نساء ع ۱۷)	اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا (یعنی وہ بندہ مسلم ہو گیا)
(۳) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران ع ۹)	اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے وہ ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آدمی آخرت میں سخت نقصان میں رہیگا

غرضکہ اسلام کی اصل روح یہ ہی ہے کہ آدمی اپنے کو کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے اور ہر پہلو سے اس کا مطیع ہوجائے۔ انبیائے کرام جو شریعتیں لائے اس میں اس اسلام کیلئے انہوں نے چند ارکان کی نشاندہی فرمائی، جن کی حقیقت اس "حقیقتِ اسلام کے لئے پیکرِ محسوس کی ہے اور اس حقیقت کا نشو و نما اور اس کی تازگی تھی ارکان سے ہوتی ہے جو تعبّدی امور ہوتے ہیں اور ظاہری نظر تھی ارکان کے ذریعہ ان لوگوں میں فرق و امتیاز کرنی ہے جنہوں نے اپنا دستورِ حیات اسلام کو بنایا ہے اور جنہوں نے نہیں بنایا۔ بہرحال حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستورِ حیات ہمارے سامنے رکھا۔ اس میں آپ نے عباداتِ الٰہی نماز، زکوٰۃ اور روزہ کو قرار دیا اور مفصل حدیث میں توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمدی کی شہادت نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حجِّ بیت اللہ کو قرار دیا (مسلم شریف) اور فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

(۱) کلمۂ شہادت (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ اور (۵) حج۔

عبادت کے معنیٰ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ کی عبادت کیجائے عبادت کے معنیٰ انتہاءِ تذلّل اور غایتِ خضوع کے ہیں یعنی انسان اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلّت و پستی کے اس آخری درجے میں سمجھے کہ جس کے بعد عاجزی اور ذلّت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو۔ اس قسم کی عاجزی کرنے والا عابد ہے اور ایسی عاجزی عبادت ہے۔ عبادت کا تعلق نہ تو مافوق الاسباب امور سے ہے اور نہ غائبانہ ندا سے بلکہ اس کا تعلق محض اعتقاد سے ہے اور ظاہر ہے ایسی عاجزی اور ایسی ذلّت و پستی کا اظہار اسی ہستی کیلئے کیا جاسکتا ہے جس کے متعلّق صفاتِ مُستقلہ کا اعتقاد رکھا جائے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں (خود بخود اس میں موجود ہیں کسی نے اس کو کوئی صفت دی نہیں) اور یہ صفاتِ ذاتیہ استحقاقِ عبادت کا مناط و مدار ہیں۔ ان صفاتِ ذاتیہ کا کسی میں ثابت کرنا اِستحقاقِ عبادت و الوہیت کا ثابت کرنا ہے اور جو صفت استحقاق عبادت کا مناط ہے خواہ وہ علم ہو یا قدرت تصرّف ہو یا خالقیت، ان کا ذاتی اور مستقل ہونا ضروری ہے، ورنہ افرادِ ممکنات کا مستحق عبادت ہونا

لازم آئیگا کیونکہ "عطائی غیر مستقل حادثِ صفات" افرادِ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ استحقاقِ عبادت کیلئے صفاتِ مُستقلہ لازم ہیں اور صفاتِ مستقلہ کے لئے استحقاقِ عبادت لازم ہے۔ کسی کو مُستحقِ عبادت کہنا اس کے لئے استقلالِ ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مُستقل بالذات ماننا مُستحقِ عبادت قرار دینا ہے۔

عبادت وتعظیم میں فرق یہیں سے عبادت وتعظیم میں فرق معلوم ہوگیا۔ عبادت میں تعظیم بھی ہوتی ہے اور جس کی تعظیم کی جائے اس کی الوہیّت اس کے واجب الوجود اور مستحقِ عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہوتا ہے اور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا۔ یعنی ہر عبادت تعظیم ہے مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تعظیم شرک نہیں بلکہ جائز بلکہ بعض کی تعظیم فرضِ عین ہے۔ مثلاً قرآن پاک کی انبیاءِ کرام علیہم السّلام وملائکہ کی تعظیم وتوقیر اور بعض کی تعظیم واجب ہے مثلاً بعض لوگ والدین کی تعظیم وعبادت میں فرق نہیں کرتے یا ان کے مفاہیم سے جاہل ہیں۔ جہاں وہ غیر اللہ کی تعظیم ہوتی دیکھتے ہیں جھٹ شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ بات بدیہی ہے کہ تعظیم کی وہی صورت شرک قرار دی جائے جس میں مُعظَّم کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔ اس کے علاوہ تعظیم کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہیں ان میں سے بعض ناجائز وحرام تو ہو سکتی ہیں مگر شرک وکفر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں مثلاً قبر کو سجدہ کرنا اور مقبور کی الوہیّت اور واجب الوجود ہونے کا عقیدہ رکھ کر اور اس کے لئے صفاتِ مستقلہ مان کر سجدہ کرنا شرک ہے لیکن اگر یہ اعتقاد نہ ہو اور محض مقبور کی تعظیم کیلئے سجدہ کرے تو ناجائز وحرام ہے مگر شرک نہیں ہے۔ غرضکہ وہ تعظیم جو مُعظَّم کی الوہیّت وواجب الوجود ہونے کے اعتقاد کے ساتھ نہ کی جائے۔ اس میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس تعظیم کی کچھ صورتیں ناجائز وحرام ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اعتقاد کے ساتھ جو تعظیم کی جائے وہ شرک قرار پائے۔ سجدہ ہی کو لے لیجئے۔ مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگر شرک مان لیا جائے تو پھر معاذ اللہ تمام ملائکہ اور برادرانِ یوسفؑ بھی مُشرک قرار پائیں گے کیونکہ قرآنِ پاک نے یہ تصریح کی ہے کہ ملائکہ نے حضرت آدمؑ کو اور برادرانِ حضرت یوسفؑ نے حضرت یوسف کو سجدہ کیا تھا بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ خود اللہ عزّوجل نے شرک کا حکم دیا (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اور برادرانِ یوسف کا جناب یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا۔ ان کو واجب الوجود جان کر سجدہ کرنا نہ تھا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کی مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے لئے سجدہ تھا جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو تعظیم معظَّم کی الوہیّت اور واجب الوجود ہونے کے عقیدہ کے ساتھ نہ کی جائے وہ شرک ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ۔

ہم اہل سنّت و جماعت انبیاءِ کرام و بزرگانِ عظام کی تعظیم ضرور کرتے ہیں۔ ان سے محبّت و عقیدت رکھتے ہیں مگر انہیں الٰہ نہیں مانتے اور نہ استقلالِ ذاتی ان کیلئے ثابت کرتے ہیں اور نہ انہیں مُستحقِ عبادت جانتے ہیں اور نہ واجب الوجود لہٰذا ہم پر محض تعظیم کے جرم میں وہابیہ و دیوبندیہ کا شرک کا فتویٰ دینا کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ ہم تعظیم کی ان صورتوں کو بھی نہیں اپناتے جو ناجائز و حرام ہیں ۔ اور جن کے ناجائز ہونے پر دلائلِ شرعیہ مل جاتے ہیں ، جیسے سجدہ تعظیمی ہم اس کو حرام و ناجائز سمجھتے ہیں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کیلیے سجدہ تعظیمی کو بھی حرام قرار دیا ہے ۔ فافہم

شرک کی تعریف شرک کے معنی ہیں اللہ کے سوا کسی اور کو خدا جاننا یا عبادت کے لائق سمجھنا یا خدا کی صفات جیسی کہ اس کی ہیں کسی اور میں ماننا یعنی اللہ کی تمام صفتیں ازلی، ابدی، قدیم اور ذاتی ہیں مثلاً اس کا علم ذاتی ہے اس کا ہر کمال ابدی ہے کسی نے اس کو دیا نہیں وہ خود بخود علیم، خبیر، عالم الغیب قادر اور مُختار ہے تو بالکل اسی طرح غیر اللہ میں کسی صفت کو مانا جائے تو یہ یقیناً شرک ہے اور اگر اس طرح نہ مانا جائے تو یہ ہرگز ہرگز شرک نہیں ، شرح عقاید نسفی میں ہے ۔

الاشراك هو اثبات الشريك فى الالوهية	شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیّت میں شریک ثابت کیا جائے
يعنى واجب الوجود كما للمجوس او بمعنى	بمعنی وجوبِ وجود جیسا مجوس کرتے ہیں یا بمعنی استحقاقِ
استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام	عبادت جیسا بت پرست کرتے ہیں۔ (شرح عقائد)

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں : بالجملہ شرک سہ قسم است در وجود و

درخالقیت و درعبادت" ـــــــــ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شرک تین طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کو واجب الوجود جانے ـــــ دوم یہ کہ اور کو اللہ کے سوا خالق جانے۔ ـــــ سوم یہ کہ غیرِ خدا کی عبادت کرے (یا اس کو مستحقِ عبادت سمجھے)۔ (جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے (۱) واجب الوجود اپنی ذات اور کمالات میں دوسرے سے بالکل بے نیاز اور غنی بالذّات صرف اللہ عزّوجل ہے اور فقط وہی عبادت کا مستحق ہے اور کوئی نہیں (۲) اب جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو واجب الوجود جانے یعنی یہ کہے کہ یہ شخص اپنی ذات اور کمالات میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یا اللہ کے سوا کسی اور کو عبادت کا مستحق ٹھہرائے وہ یقیناً مُشرک ہے جیسے ہندوستان کے آریہ روح اور مادّہ کو قدیم مانتے ہیں اور واجب الوجود سمجھتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ روح اور مادّہ کی ذات بنانے والے سے بے نیاز ہے۔ یہ مُشرک ہیں (۳) اسی طرح اگر کوئی کسی کے کمالات کو ذاتی مانے اور اس کمال میں اس کو دوسرے سے غنی اور بے نیاز سمجھے تو مشرک ہے خواہ وہ کمال علم ہو یا قدرت یا حیات یا سمع یا بصر ہو جیسے ستارہ پرستوں کا خیال ہے کہ عالم کے تغیّرات کواکب کی تاثیرات سے ہیں اور کواکب ان تاثیرات میں غنی بالذّات ہیں کسی کے محتاج نہیں۔ یہ عقیدہ بھی شرک ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے مُشرک ـــــ اسی طرح اگر کوئی کسی دوسرے کی عبادت کرے جس کو ہندی میں پوجا اور فارسی میں پرستش کہتے ہیں یہ بھی شرک ہے جیسے بت پرست بتوں کو مستحقِ عبادت سمجھتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں یہ مُشرک ہیں لیکن جو لوگ اللہ کے عطا کئے ہوئے کمالات اس کے بندوں میں مانتے ہیں اور کمالات کو عطاء الٰہی جانتے ہیں وہ ہرگز مُشرک نہیں مثلاً کوئی شخص آدمی کو سمیع و بصیر کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صفتِ سمع و بصر عطا فرمائی ہے تو وہ مومن اور موحّد ہے مُشرک نہیں۔ مُشرک جب ہوتا جب کہ یہ مانتا کہ آدمی میں سمع و بصر کی صفت ذاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ عزّوجل کی صفات میں سمیع و بصیر ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود انسان کو بھی سمیع و بصیر قرار دیا ہے فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا

بَصِیْرًا ۔ اور یہ شرک اس لئے نہیں کہ انسان میں جو سمع وبصر ثابت کی گئی ہے وہ عطائی ہے اور خدا میں ذاتی ہے اس قسم کی سینکڑوں مثالیں کتاب وسنّت سے دی جا سکتی ہیں ۔ جن کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کسی بھی کمال کو جو ممکن بالبشر ہے غیر اللہ میں عطائی مانا جائے تو شرک نہیں اور ذاتی مانا جائے تو شرک ہے ، اگر ذاتی وعطائی کا فرق نہ کیا جائے تو پھر تو انسان ہر بات میں مُشرک ہو جائے ۔ مثلاً یہ کہے میں سنتا ہوں ، میں دیکھتا ہوں ، میں موجود ہوں ۔ غذا نے قوّت دی ۔ پانی نے پیاس بجھائی ۔ آگ نے جلا دیا ، سردی نے نقصان پہنچایا ۔ دوا نے فائدہ دیا ۔ یہ سب باتیں شرک ہو جائیں ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ایک مُسلمان یہ کہتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں تو وہ اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دیکھنے کی قوّت مجھ میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے خود بخود نہیں ہے ، جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ دوا نے شفا دی تو اس عقیدہ کے ساتھ کہتا ہے کہ دوا میں شفا دینے کی طاقت اور تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے ، اگر خدا نہ چاہے تو نہ میں دیکھ سکوں اور نہ دوا اپنا اثر دکھا سکے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی کمال کو غیر اللہ میں اگر ذاتی مانا جائے تو وہ شرک ہے اور اگر عطائی طور پر مانا جائے تو ہرگز شرک نہیں ہے جو شخص عطائی کمال کو غیر اللہ میں ماننے کو شرک کہتا ہے وہ جاہل ہے اور اگر جان بُوجھ کر کہتا ہے تو خود کافر ہے کیونکہ اس نے عطائی کمال ماننے والے کو مُشرک کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات اور صفات عطائی ہیں اور وہ مستغنی اور بے نیاز نہیں ہے ۔

اِحسان کے معنیٰ ایمان اور اسلام کے بعد سائل نے احسان کے متعلق حضور علیہ السّلام سے پوچھا کہ احسان کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ احسان بھی دراصل اسلام اور ایمان کی طرح دینی اور قرآنی اِصطلاح ہے ارشادِ ربّانی ہے ،

(۱) بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۔	ہاں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ مُحسن ہے (یعنی وصفِ احسان اس میں موجود ہے) تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے ۔
(۲) وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ	اور اس سے اچھا دین اور کس کا ہو سکتا ہے جس نے

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ   اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ محسن ہے ۔

معلوم ہوا کہ احسان قرآنِ پاک کی ایک خاص اصطلاح ہے اور یہ ایک خاص وصف ہے جو مومن مخلص میں پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے ثوابِ عظیم ملتا ہے ویسے تو اِحسان کے معنیٰ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں لیکن حدیث ہٰذا میں جس احسان کا ذکر ہے اس کی حقیقت خود زبانِ نبوتؐ نے بیان فرما دی ہے یعنی اِحسان یہ ہے کہ :-

”خدا کی بندگی ایسے کی جائے کہ وہ قہّار و قدّوس ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔“

اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ اسکے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویّہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے - عموماً ان دونوں وقتوں کے طرزِ عمل میں فرق ہوتا ہے اور عام طور پر جس خوش اسلوبی، محنت اور دیانت کے ساتھ وہ آقا کی موجودگی میں کام کرتا ہے ۔ مالک کی عدم موجودگی میں اس کا وہ حال نہیں ہوتا تو یہی حال بندوں کا اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ ہے جس وقت یہ محسوس کرے کہ میرا رب میری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے وہ حاضر و ناظر ہے میرے ہر کام کی اس کو خبر ہے اس تصوّر کے ساتھ بندہ جب عبادت کرتا ہے تو اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیاز مندی ہو گی جو اس وقت نہیں ہو سکتی جب کہ بندہ کا دل اس احساس سے خالی ہو تو اِحسان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طریقہ سے کی جائے کہ گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہم کو دیکھ رہا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احسان اور اِحتساب دونوں ایک ہی چیز ہیں - اِحتساب کے معنیٰ یہ ہیں کہ عمل میں خلوص انتہا کو پہنچ جائے اور ریا کا شائبہ بھی نہ رہے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ یہ یقین محکم ہر وقت قائم رہے کہ اس قادر و قدیر خدا سے ہماری کوئی حرکت پوشیدہ نہیں رہے اور جب اس تصوّر سے عمل کیا جائے تو یقیناً اس میں خلوص ہو گا۔

ہر عمل میں احسان پھر احسان کا تعلّق صرف نماز ہی سے نہیں ہے کہ بس نماز کو پورے خضوع و خشوع سے ادا کر لیا جائے بلکہ اس کا تعلّق انسان کی پوری زندگی سے ہے اسی لئے اس واقعہ کی دوسری روایات کے الفاظ یہ ہیں :۔

۱۔ اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ احسان یہ ہے کہ تم خدا سے اس طرح ڈرو گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہو۔

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ کے لئے اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

ان دونوں روایتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احسان کا تعلّق صرف نماز سے نہیں بلکہ تمام اعمالِ خیر سے ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی اور اس کے ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس کے مُواخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان ہے۔

کیا دنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن ہے؟ بعض لوگ کَاَنَّکَ تَرَاہُ حدیث کے اس ٹکڑے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں اللہ عزّ وجل کا دیدار ہو سکتا ہے وہ کہتے ہیں تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ اشارہ ہے مقامِ فنا کی طرف کہ جب بندہ اپنی ذات کو بالکل فراموش کر دے گویا کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو اس منزل پر پہنچکر وہ خدا کو دیکھ لے گا لیکن یہ معنی کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلّق تو نصوص موجود ہیں کہ دنیا میں خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ مسلم شریف میں ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا (مسلم شریف) جان لو تم اس دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتے حتّٰی کہ تم مر جاؤ۔

(۱) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دنیا میں دیدارِ باری تعالیٰ ممکن نہیں البتہ آخرت میں ہر مومن کو اس کے

دیدار کا شرف حاصل ہوگا جیسا کہ اہلِ سنّت و جماعت کا مذہب ہے (۲) اس کے علاوہ قرآن پاک میں ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ؕ   اپنے رب کی موت آنے تک عبادت کرو۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک مُکلّف ہے جب تک کہ زندہ ہے اور مر جانے کے بعد اس پر کچھ فرض نہیں رہتا تو اگر عبادت میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو جاتا ہے تو پھر تو دیدارِ باری کے بعد اس پر نماز فرض ہی نہیں رہے گی کیونکہ دیدارِ باری موت کے بعد ہی ہوتا ہے تو چاہیئے کہ جس کو خدا کا دیدار ہو جائے وہ عبادت ہی ترک کر دے حالانکہ یہ بات نہیں ہے (۳) نیز الفاظِ حدیث بھی اس مطلب کے متحمّل نہیں ہیں کیونکہ "كَاَنَّكَ تَرَاهُ" کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم عبادت میں اتنا خلوص خشوع اور خضوع پیدا کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ تو اگرچہ تم اس کو دیکھتے نہیں تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے اور جب وہ تم کو دیکھ رہا ہے تو پھر عبادت و بندگی ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ مالک کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ غرضکہ حدیث کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ عبادت میں جب بندہ محو ہو جائے اور اپنی ذات کو فنا کر دے تو پھر وہ خدا کو دیکھ لیتا ہے (۴) ہاں بعض عرفاء کرام نے حدیث کے اس ٹکڑے کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس میں عبادت کے دو درجوں کی طرف اشارہ ہے۔

اوّل: كَاَنَّكَ تَرَاهُ عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو یعنی عبادت مُشاہدۂ حق کے ساتھ ہو یہ مقام ہے عرفاء کاملین کا۔ دوم: فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ پس اگر یہ مقام (مشاہدہ) تمہیں حاصل نہ ہو تو پھر عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ مقام ہے درجہ دوئم کے عارفوں کا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں مُشاہدہ حق سے ذاتِ خدا کی رویت مُراد نہیں بلکہ تجلّیات و انوارِ صمدیہ کی رویت مُراد ہے اور یہ بات بالکل حق ہے کہ ہر ایک کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا کہ وہ برکاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ بھی کرے۔ اسکا مدار تو قلب کی صفائی، باطن کی پاکیزگی اور تقویٰ کی زیادتی پر ہے جس کا تقویٰ بڑھا ہوا ہوگا وہ یقیناً انوارِ صمدیت اور برکاتِ احدیّت کا مشاہدہ کرے گا اور جو اس درجہ پر نہ ہوگا وہ نہ کر سکیگا۔ بہرحال اس توجیہ پر احسان کے دو درجے ہو گئے۔

marifat.com

قیامت کا اعتقاد اس کے بعد سائل نے پوچھا حضور (علیہ السلام) قیامت کب آئے گی۔ اس کے جواب میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے سوال ہو رہا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا یعنی قیامت امورِ غیب سے ہے اور غیب کا علم بے تعلیمِ الٰہی بحسابِ عقل کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں امورِ خمسہ کا ذکر ہے کہ ان کو بالذّات خدا ہی جانتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الخ واضح ہو دینِ اسلام کے ایمانیات کی آخری کڑی قیامت پر ایمان ہے وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ یعنی ایک دن ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور اللہ عزّ وجل کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا دوبارہ مخلوق کو پیدا فرمائے گا۔ قرآن پاک میں قیامت کا بیسیوں ناموں سے ذکر آیا ہے اور ہر نام اس کے خاص پہلو نمایاں کرتا ہے۔ مختصر یوں کہہ لیجئے کہ ایک دن ایسا آنا ہے جبکہ سوا خداوندِ عالم کے سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ اعمال کا مُواخذہ ہو گا حساب و کتاب کے بعد نیکیوں کا ثواب ملے گا اور برائیوں پر سزا دی جائے گی جنّتی جنّت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل کر دیئے جائیں گے اور حیات و ممات کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

قیامت کی علامتیں اس کے بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامتیں بیان فرمائیں۔ حدیث ہذا میں صرف دو علامتوں کا ذکر فرمایا لیکن دوسری احادیث میں علاماتِ قیامت کا تفصیلی بیان ہے۔ اس حدیث میں قیامت کی دو خاص نشانیاں بیان فرمائیں جو یہ ہیں:۔

اول: یہ کہ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ گو شارحین نے اس جملہ کے متعدّد مفہوم بتائے ہیں مگر سب سے زیادہ راجح توجیہہ جو الفاظِ حدیث سے بالکل مُطابق ہے۔ یہی ہے کہ قُربِ قیامت میں ماں باپ کی نافرمانی ہو جائے گی۔ اسی واقعہ کی دوسری روایت میں ربّتہا کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب لونڈی اپنے مالکہ کو جنے گی یعنی عام طور پر لڑکیاں جن میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے اور جن سے لڑکوں کے بالمقابل والدین سے سرکشی بظاہر بہت ہی مُشکل ہوتی ہے وہ بھی قربِ قیامت میں

نہ صرف یہ کہ والدین کی نافرمان ہوجائیں گی بلکہ اُلٹی ان پر حکومت چلائیں گی جس طرح ایک مالکہ اپنی زرِ خرید لونڈی پر حکومت کرتی ہے اسی کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا کہ عورت اپنی مالکہ کو جنے یعنی عورت سے جو لڑکی پیدا ہوگی وہ بڑی ہوکر خود اپنی ماں پر حکومت چلائے گی اور جب لڑکیوں کا یہ عالم ہوگا تو لڑکوں کا کیا حال ہوگا۔

دوم: دُوسری علامت حضور علیہ السّلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ قُربِ قیامت میں کالے اُونٹ چرانے والے اونچے اونچے محل بنوائیں گے اور تکبّر و غرور کریں گے۔ عرب میں سیاہ اُونٹ حقیر سمجھے جاتے تھے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ دنیاوی دولت و حکومت ان کمینوں اور رذیلوں کے ہاتھ آجائے گی جو اس کے اہل نہ ہوں گے۔ یہ شاندار محل بنوانے اور اپنے عیش و آرام کے سامان مہیا کرنے میں مصروف رہیں گے اور اسی کو سرمایۂ فخر و مباہات جانیں گے۔ اور اپنے ذاتی مفاد کیلئے جوڑ توڑ کرتے رہیں گے۔ ان کے دلوں میں قوم کا درد نہ ہوگا۔ یہ متکبّر اور ظالم ہوں گے۔ اور اسی ظُلم و تکبّر میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے اسی مضمون کو حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بھی ادا فرمایا ہے:۔

إِذَا اُسِدَ الْاَمْرُ اِلیٰ غَیْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ	جب حکومت اور مناصب نااہلوں کے سپرد ہونے لگیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔

کوئی شک نہیں، زبانِ نبوّت کی ان پیشین گوئیوں کے ظہور کی ابتدا ہو چکی ہے۔

جبرئیل کی واپسی جب یہ سوال و جواب ختم ہو گئے تو سائل اٹھ کر چلے گئے حضور علیہ السّلام نے فرمایا یہ جبرئیلِ امین تھے اس لئے آئے تھے تاکہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ ظاہر ہے کہ جبرئیل علیہ السّلام سائل بن کر آئے نہ کہ مُعلّم مگر اس کے باوجود ان کو مُعلّم اس لئے فرمایا کہ ان کے سوال کے ذریعہ سے صحابہ کو دین کی تمام ضروری باتوں کا علم ہو گیا اور زبانِ نبوّت سے دین کا خلاصہ اور لبّ لباب بیان کروا کر صحابہ کے علم کی تکمیل کرادی گئی اور ان کو اس امانت امین بنا دیا گیا

کیا قیامت کا علم کسی کو نہیں؟ مُنکرینِ علمِ غیب نبوی بخاری کی اسی حدیث کو بڑے زور سے پیش کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "دیکھو جب جبرئیلِ امین نے حضور علیہ السّلام سے قیامت کا وقت دریافت کیا۔ آپ نے

فرمایا کہ میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا اور اسی پر بس نہیں حضور علیہ السلام نے اسکے بعد قرآن پاک کی وہ آیت بھی بطور استشہاد تلاوت فرمادی جس میں یہ ہے کہ پانچ غیب ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا انہی میں قیامت بھی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم نہیں اور آپ جمیع اشیاء کے عالم نہیں ہیں ''

جواب : جو آیہ مبارکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن کا علم حقیقی خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور وہ یہ ہیں ۔ (۱) قیامت کا وقت (۲) بارش کب ہوگی (۳) پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی (۴) کل یہ کیا کرے گا (۵) اور کس زمین پر مرے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دیانتداری کے ساتھ دلائل شرعیہ پر نظر رکھتے ہوئے یہ غور کیا جائے کہ اس آیت کا صحیح مطلب کیا ہے -

(۱) یہ پانچ غیب کی باتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کسی کو بتانے پر قادر نہیں ہے اگر مطلب یہ لیا جائے تو عقلاً و نقلاً باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان پانچ امور غیبیہ پر کسی کو مطلع کرنے پر بھی قادر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہوگا جو یقیناً کفر ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ ان اُمورِ غیبیہ پر کسی کو مطلع کرنے پر قادر ہے۔

(۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مطلع کر دینے اور بتا دینے سے بھی کوئی ان غیب کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتا تو ایسا کہنا صریحاً جہالت ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا علم عطا فرما دیا تو وہ شخص اس چیز کا عالم ہو گیا۔ عالم کو جاہل کہنا اپنی جہالت کا اعتراف ہے ۔

(۳) یہ کہ اللہ تعالیٰ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا تو یہ بھی غلط ہے اور ایسا کہنا قرآن اور حدیث کی متعدد نصوص کا انکار کرنا ہے جو کفر ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر اپنے برگزیدہ رسولوں کو مطلع کرتا ہے وہ آیت یہ ہے۔ فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ جس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص رسولوں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے۔

(۴) یہ کہ غیب پر مطلع تو فرماتا ہے مگر ان پانچ چیزوں پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا تو ایسا کہنا بھی غلط ہے کیونکہ

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ امور کا علم بھی عطا فرمایا جیسا کہ ابھی ہم ذکر کریں گے۔

لہٰذا اس توضیح سے آیت کا مفہومِ صحیح یہ معلوم ہوا کہ یہ پانچ امورِ غیبیہ بالذّات صرف اللہ ہی جانتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ خدا کا علم ذاتی ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا بالذّات عالم نہیں ہے تو آیت زیرِ بحث میں جو یہ فرمایا گیا کہ پانچ باتوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس علم سے علمِ ذاتی مراد ہے۔ اب رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بھی کسی کو ان پانچ باتوں کا علم عطائی نہیں حاصل ہوتا ہے اس میں اس کی ہرگز ہرگز نفی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں جہاں کہیں بھی غیر اللہ سے غیب کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہی ذاتی علم کی نفی ہے عطائی کی نہیں اور جب آیت میں ذاتی علم کی نفی ہے تو حضور علیہ السّلام کے ان کلمات کہ:

”جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے وقت کے متعلق سائل سے زیادہ نہیں جانتا“۔ میں بھی ذاتی علم کی نفی ہے یعنی اٹکل سے یا بالذّات نہ تم وقتِ قیامت کو جانتے ہو اور نہ میں۔ رہا اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے سے جاننا۔ اس کی نفی نہ آیت میں ہے اور نہ حضور علیہ السّلام کے ان کلمات میں۔ چنانچہ شیخ عبدالحق مُحدّث دہلوی علیہ الرحمۃ نے اشعۃ اللمعات شرحِ مشکوٰۃ کتاب الایمان میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

مُراد آنست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل ہیچ کس اینہا را ندانند از امورِ غیب اند کہ جز خدا کسے آں را ندانند مگر آں کہ وے تعالیٰ از نزدِ خود کسے را بوحی و الہام بدانانند۔

یعنی مراد یہ ہے کہ ان امورِ غیب کو بغیر اللہ کے بتائے ہوئے عقل کے اندازے سے کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ ان کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے بتادے وحی سے یا الہام سے۔

تفسیراتِ احمدیہ میں اسی آیت کے ماتحت شیخ ملّا جیون استادِ عالمگیر بادشاہ علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا کہ اگرچہ ان پانچوں باتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے محبوبوں اور ولیوں میں سے جس کو چاہے بتادے کیونکہ لفظ خبیر بمعنی مُخبِر ہے۔ (تفسیراتِ احمدیہ)

یہی مضمون تفسیر صاوی زیرآیت مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا تفسیر عرائس البیان زیرآیت يَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وتفسیر روح البیان وغیرہ دیگر تفاسیر میں ہے کہ ان پانچوں باتوں کا علم بے تعلیم الٰہی کسی کو نہیں لیکن اللہ کی تعلیم دینے سے انبیاءِ کرام کو اور ان کے وسیلہ سے اولیاءِ کرام کو بھی حاصل ہے۔

اب ہم ان احادیث کو بھی پیش کر دیں جن سے یہ واضح ہو گا کہ حضور علیہ السلام کو امورِ خمسہ کا علم بھی عطا ہوا چنانچہ بخاری شریف کتاب بَدْءِ الْخَلْقِ وَذِكْرِ الْاَنْبِيَاءِ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے آفرینش سے تا قیامِ قیامت کی خبر دے دی حتّٰی کہ اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ نار دوزخ میں پہنچ گئے یعنی از روزِ اول تا قیامِ قیامت ایک ایک ذرّہ کی خبر حضور علیہ السلام نے دے دی۔ مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں:

۱۔ فَاَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مشکوٰۃ باب المعجزات)

ہم کو حضور علیہ السلام نے تمام ان واقعات کی خبر دے دی جو قیامت تک ہونے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے قیامت تک ہونے والے واقعات بیان فرما دیئے تو اب کیسے ممکن ہے کہ آپ کو قیامت کا علم نہ ہو کیونکہ دنیا ختم ہوتے ہی قیامت ہے اور حضور علیہ السلام کو یہ علم ہے کہ کون سا واقعہ کس کے بعد ہو گا تو جو آخری واقعہ ارشاد فرمایا وہی دنیا کی اِنتہا ہے اور قیامت کی ابتدا تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام کو قیامت کے وقت کا علم ہے۔

۲۔ ترمذی بَابُ الْعَلَامَاتِ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ میں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فتنۂ یاجوج ماجوج کے بعد اللہ تعالیٰ عالمگیر مینہ بھیجے گا۔

مشکوٰۃ باب لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى اَشْرَارِ النَّاسِ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب سب لوگ مر جائیں گے .... تو بارش ہو گی جس سے آدمیوں کے جسم بحال ہو جائیں گے دیکھئے بارش کب آئے گی؛ اس کی خبر حضور علیہ السلام سینکڑوں برس پہلے دے رہے ہیں۔

۳۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام مہدی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ اس سے واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام کو لڑکا پیدا ہونے کی خبر اس وقت سے ہے جب نطفہ بھی باپ کی پیٹھ میں نہیں۔ ایسے ہی حضور علیہ السلام نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ (مشکوٰۃ شریف)

(۴) کل کی بات کی اطلاع اسی حدیث سے ثابت ہو رہی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے قیامت تک ہونے والے واقعات بیان فرما دیئے نیز بوقتِ جنگِ خیبر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کل ہم فوج کا نشان ایسے شخص کو دیں گے جس کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ کل کی خبر حضور علیہ السلام نے دی۔

(۵) خود اپنی وفات شریف کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ معاذ قریب ہے کہ اس سال کے بعد ہماری تمہاری ملاقات نہ ہو اور تم میری اس مسجد اور قبر پر گزرو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں عسی ان تلقانی بعد عامی ھٰذا ولعلك ان تمر بمسجدی ھذا وقبری۔ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے نہ صرف اپنی وفات کی اطلاع دی بلکہ اپنی وفات کی جگہ اور قبرِ مبارک کی جگہ بھی بتا دی۔ بہرحال اس قسم کے مضمون کی سینکڑوں حدیثیں ہیں جو اس امر پر دال ہیں کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ باتوں کا علم بھی عطا فرما دیا۔

الغرض حضور علیہ السلام کے جوابی کلمات ما المسئول عنھا باعلم من السائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضور کو قیامت کا علم نہیں تھا۔ پھر اعلم صیغہ اسمِ تفضیل کا ہے جس کے معنیٰ ہیں "بہت جاننا" تو حضور نے اپنے جاننے کی نفی نہیں فرمائی بلکہ زیادہ جاننے کی نفی فرمائی ورنہ لا اعلم فرماتے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ میں نہیں جانتا بلکہ یہ فرمایا جبریل! میں تم سے زیادہ نہیں جانتا یعنی مجھ کو بھی قیامت کے وقت کی خبر ہے اور تم کو بھی، مگر مجمع میں پوچھ کر راز ظاہر کرانا مناسب نہیں ہے۔ اسی لئے جبریل امین نے حضور سے قیامت کی نشانیاں پوچھیں اور حضور علیہ السلام نے بتائیں بلکہ کثیر علاماتِ قیامت متعدد دوسری احادیث میں بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ جس کو قیامت کا بالکل علم نہ ہو۔ اس سے

قیامت کی علامات پوچھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ البتہ جبریلِ امین کے سوال کرنے اور حضور علیہ السّلام کے اس طرح جواب دینے سے لوگوں کو بتانا مقصود ہے کہ وقتِ قیامت کا علم بالذّات اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ کہ ایک مومن کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ قیامت پر ایمان لائے اور قیامِ قیامت کو حق سمجھے اور بس لیکن وقتِ قیامت کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے چنانچہ اس حدیث کی شرح میں حضرت ملّا علی قاری نے مرقاۃ جلد اول میں اور امام قسطلانی و علّامہ عینی نے تحریر فرمایا ہے۔

فَمَنِ ادَّعٰی عِلْمَ شَیْئٍ مِّنْهَا غَیْرَ مُسْتَنِدٍ	جو شخص ان پانچ چیزوں میں سے کسی چیز کے علم کا
لٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ	دعویٰ کرے حضور علیہ السّلام کی نسبت کے بغیر وہ اپنے
کَانَ کَاذِبًا فِی دَعْوَاهُ (عینی جلد اول ص۳۳)	دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

یعنی جو شخص یہ کہے کہ میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر قیامت کے وقت کو جانتا ہوں وہ جھوٹا ہے کیونکہ حضورِ اکرم علیہ السّلام کے واسطے کے بغیر کوئی غیب پر مطّلع نہیں ہو سکتا۔ لمعات میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

المراد لا تعلم بدون تعلیم	مراد یہ ہے کہ ان پانچ باتوں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے
اللہ تعالیٰ	بغیر کوئی نہیں جانتا۔

حضرت ملّا علی قاری علیہ الرحمۃ نے اسی حدیث کی شرح میں لکھا کہ جب روح روشن ہو جائے اس کی نورانیت اور اشراق میں اضافہ ہو اور آئینۂ قلب کدوراتِ نفسانیہ سے پاک ہو جائے اور بندہ علم و عمل پر مُواظبت کرے یعنی سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے اور شریعت کی پابندی کرے۔

حَتّٰی یَقْوِیَ النُّوْرُ وَ یَنْبَسِطَ مِنْ فَضَاءِ	حتّٰی کہ اس کا نور قوی ہو جائے اور فضاءِ قلب میں
قَلْبِهٖ فَتَتَعَکَّسُ فِیْهِ النُّقُوْشُ الْمُرْتَسِمَةُ	پھیل جائے تو پھر لوحِ محفوظ کے نقوش کا عکس آتا ہے
فِی اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَیَطَّلِعُ عَلٰے	اور آدمی مغیبات پر مطّلع ہوتا ہے اور اجسام [illegible] سفلیہ

الْمُغَيَّبَاتِ وَيَتَصَرَّفُ فِي أَجْسَامِ الْعَالَمِ السِّفْلِيِّ بَلْ	تصرف کرتا ہے بلکہ اس وقت فیاضِ اقدس کی
يَتَجَلَّى حِيْنَئِذٍ الْفَيَّاضُ الْأَقْدَسُ بِمَعْرِفَتِهِ الَّتِي	معرفت کا انکشاف ہوتا ہے جو کہ بہترین نعمت
هِيَ أَشْرَفُ الْعَطَايَا فَكَيْفَ بِغَيْرِهَا (مرقات ج ۱ ص۵۵	ہے تو دیگر نعمتیں کس شمار ہیں؟

حضرت ملا علی قاری کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بندہ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اسکے لئے لوحِ محفوظ کے نقوش اور غیوب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جب ایک مومن و متقی کا یہ حال ہے تو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مرتبہ ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حدیثِ زیرِ بحث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ (۱) ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کے رسولوں پر اور بعث و نشور پر ایمان لائے یعنی ان حقیقتوں پر ایمان لایا جائے۔ جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائیں (۲) اسلام یہ ہے کہ بندہ اپنے کو بالکل اللہ کا مطیع و فرمانبردار بنا دے اسی کا نام اسلام ہے اور ارکانِ اسلام عبادت۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اسی کے مظاہر ہیں..... احسان یہ ہے کہ اللہ کی ہستی کا ایسا استحضار اور دل کو مراقبہ حضور و شہود کی ایسی کیفیت نصیب ہو جائے کہ اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی بندگی اس طرح ہونے لگے گویا کہ وہ پاک بے نیاز اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔

مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے دین کی باتیں پوچھ لو صحابہ کرام جب سوالات کے لئے تیار ہوئے تو پھر جبریلِ امین انسانی شکل میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مذکورہ بالا سوالات کئے (مرقات جلد اول ص۴۴) معلوم ہوا کہ جبریلِ امین کی حاضری اس لئے تھی تاکہ وہ عمل سے بتا دیں کہ نبی (علیہ السلام) کے دربار میں حاضری کے آداب کیا ہیں اور نبی سے سوال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سلیمان تیمی کی روایت میں یہ ہے کہ جبریلِ امین دربارِ نبوت میں ایسے بیٹھے جیسے نمازی نماز میں بیٹھتا ہے: کما یجلس احدنا فی الصلوٰۃ (عینی جلد اول ص۳۲۹) مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے جو روایت ہے اس میں یہ بھی ہے کہ جبریلِ امین حضور علیہ السلام کے دربار میں دو زانو ہو کر بیٹھے اور آپنے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیئے۔

حضرت ملا علی قاری اس موقع پر لکھتے ہیں کہ جبریلِ امین بالکل انسانی شکل میں حاضر ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ نوری لباسِ بشری میں آتے ہیں اور اس میں حکمت یہ تھی کہ لوگوں کا ان سے رابطہ ہو جائے کیونکہ جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحضور مریم علیہا السلام بھی جبریل انسانی شکل میں آئے تھے قرآن میں ہے، فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دربارِ نبوت میں تھے کہ اچانک ایک شخص نے طلوع کیا جسکا حلیہ یہ تھا، بال بہت کالے، کپڑے انتہائی سپید، ان پر سفر کے اثرات بھی نہ تھے، پھر انہوں نے حضور علیہ السلام سے سوالات کئے آپنے انکو جواب دیئے۔ انکے جانیکے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ جبریلِ امین تھے تم کو تمہارا دین سکھانے کیلئے آئے تھے معلوم ہوا کہ نور جب لباسِ بشریت میں آئے تو اس کے ظاہری لباس کیوجہ سے اس پر بشر کا اطلاق ہو جاتا ہے مگر اس لباسِ بشری کے باوجود رہتا نور ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جبریلِ امین کو لباس انسانی میں دیکھا تو ان کو رجل کہا لیکن ان کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بشر نہیں بلکہ نور تھے تو اسی طرح حضور سیدِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں لباسِ بشریت میں جلوہ گر ہوئے ہیں اور اسی لباسِ بشریت کی وجہ سے آپ پر لفظِ بشر کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی

محمد سرِ وحدت ہے کوئی رمز اسکی کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

جبریلِ امین نے عرض کی یا رسول اللہ اخبرنی مجھے خبر دیجئے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہاں امر التدعا کیلئے ہے کیونکہ یہ قطعی بات ہے کہ انبیاءِ کرام ملائکہ علویہ سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ (مرقات جلد اول ص ۴۵)

علامہ قسطلانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جبریلِ امین کا حضور علیہ السلام سے صحابہ کی موجودگی میں سوالات کرنا اس لئے تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم و معرفت کا خزینہ ہیں حضرت ملا علی قاری نے وتوتی الزکوٰۃ کے تحت لکھا ہے کہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے یعنی جب تک کسی مستحق آدمی کو زکوٰۃ کا روپیہ دیکر اس کو اس کا مالک نہ بنا دیا جائے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

عمل کا ثواب خلوصِ نیّت پر موقوف ہے

امیر المؤمنین سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سیدِ عالم نورِ مجسّم احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کو یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا:۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوْ اِمْرَاَةٍ یَّنْکِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ (بخاری)

اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیّت کی تو جس کی ہجرت دنیا کیطرف ہو کہ اس کو پہنچے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

۲۔ محدّثینِ کرام اپنی تالیفات میں عموماً اس حدیث کو پہلے لکھتے ہیں اس سے انکی مراد اخلاصِ قصد اور تصحیحِ نیّت اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہوتی ہے۔ حافظ ابن مہدی فرماتے ہیں کہ جو شخص کتاب لکھے تو اس کو چاہیئے کہ اس حدیث سے اپنی کتاب کا افتتاح کرے (۳) ابوداؤد کا قول ہے کہ وہ چار ہزار حدیثیں جن میں مسائلِ دینیہ کا ذکر ہے انسان کو اپنے دین کے لئے ان میں سے صرف چار حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔	اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ	عمل کا دارو مدار نیت پر ہے۔
۲۔	اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ	حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے۔
۳۔	مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یُغْنِیْهِ	آدمی کے حسنِ اسلام سے یہ بات ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کو نفع نہ دے۔
۴۔	وَلَا یَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِنًا حَتّٰی	مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ

یَرْضیٰ لِاَخِیْہِ مَا یَرْضیٰ لِنَفْسِہٖ اپنے بھائی (مومن) کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

ظاہر ہے جو شخص ان چار حدیثوں پر عمل کرتا ہے وہ یقیناً پورے اسلام کو عملی طور پر قبول کرنیوالوں میں شمار ہوگا۔ غرضکہ یہ حدیث ایک ہزار حدیثوں کے برابر ہے اور انتہائی جامع حدیث ہے۔ امام قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ائمہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ثُلُثِ اسلام (دین کا تہائی حصہ) ہے۔ ابن مہدی کہتے ہیں علم کے تیس بابوں میں اس حدیث کو دخل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ستّر باب ہیں۔

یہ حدیث حضور علیہ السلام نے خطبہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس کو منبر پر بیان فرمایا۔ حضرت عمر کے سوا صحابہ میں "عمر بن الخطاب" کسی کا نام نہیں ہے اور عمر نامی صحابہ میں ۲۳ عدد افراد ہوئے ہیں۔ اسی لئے عمر کے آخر میں واؤ زیادہ لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس عمر سے عمر بن الخطاب مراد نہیں ہیں

امام نووی نے فرمایا: نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں البتہ اہلِ تحقیق نے نیت و عزم میں فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں عزم وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقدم ہو مثلاً یہ ارادہ کہ کل ہم سفر کریں گے اور قصد وہ ارادہ ہے جو فعل سے مُتّصل اور مُقترِن ہو مثلاً سفر کا وہ ارادہ جو عینِ حالتِ سفر میں پایا جاتا ہے اور نیت وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقترن و متصل بھی ہو اور یہ علم بھی اسکے ساتھ پایا جائے کہ فلاں چیز کا ارادہ کس لئے کیا جا رہا ہے۔

ہِجرۃ۔ فعلۃٌ کے وزن پر وصل کی ضد ہے۔ پھر اس کے عام معنیٰ ترکِ وطن یا ایک زمین کو چھوڑ کر دُوسری زمین میں چلے جانے کے ہوگئے۔ اصطلاحِ شریعت میں ہجرۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی اپنے دین و ایمان کو بچانے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے دارالکفر سے دارالاسلام میں چلا جائیگا اور اللہ و رسول کے پسندیدہ افعال و اعمال کو اختیار کرے۔ صحابہ کرام کو اسی لئے مہاجر کہتے ہیں کہ انہوں نے صرف دین کی خاطر اپنے محبوب وطن مکّہ کو چھوڑ دیا تھا اور مدینہ منورہ آگئے تھے۔ صحابہ کرام اس معنیٰ میں بھی حقیقی مہاجر ہیں کہ انہوں نے باطل کو ترک کیا اور حق کو قبول کیا اور حضور علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اسلام کو اپنے خون سے سینچا اور راہِ الٰہی میں ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کو اٹھایا اور اسلام پر

آنچ نہ آنے دی۔

دُنیاَ۔ فُعْلیٰ کے وزن پر ہے۔ امامِ لغت جوہری نے کہا۔ دنیا کو اس لئے دنیا کہتے ہیں کہ یہ زوال کے قریب ہوتی ہے، دنیا کی حقیقت کیا ہے، اس میں متکلّمین کے دو قول ہیں (۱) جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے دُنیا ہے (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ تمام مخلوقات جواہر ہو یا اعراض دنیا ہیں۔ قرآنِ حکیم نے فرمایا وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ دنیا کا جینا تو نہیں مگر دھوکے کا مال۔ مگر یہ اس کے لئے ہے جو دنیا ہی کا ہو جائے اور آخرت کو بھول جائے لیکن وہ شخص جو اسباب دُنیوی سے صرف آخرت کے لئے تعلّق رکھے اور خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرے تو اس کے لئے دنیا کامیابی آخرت کا ذریعہ ہے۔ حضرت ذوالنّون فرمایا کرتے تھے اے گروہ مُریدین! دنیا طلب نہ کرو اور اگر طلب کرو تو اس سے محبّت نہ رکھو۔ تو شہ یہاں سے لو، آرام گاہ اور ہے۔

حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَال کا شان ارشاد حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں ہم میں ایک شخص تھا جس نے ام قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ ام قیس نے کہا جب تک تُو مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہ کرے میں تیرے ساتھ نکاح نہیں کروں گی۔ آخر اس نے ہجرت کی اور نکاح کیا۔ ہم اس شخص کو اسی لئے مُہاجرِ ام قیس کہا کرتے تھے (طبرانی) جس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور جو شخص جس نیت سے ہجرت کرتا ہے وہی اس کے لئے ہے۔

ہجرت کے اقسام اگرچہ اس حدیث کا مورد خاص ہے مگر عمومِ لفظ کی وجہ سے تمام اقسام کی ہجرتوں کو شامل ہے، صحابہ کرام نے جو ہجرت کی وہ پانچ قسم کی تھی۔ پہلی ہجرت حبشہ کی طرف، دوسری مکّہ سے مدینہ کی طرف تیسری قبائل کی ہجرت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ چوتھی اہلِ مکّہ میں سے جو مسلمان ہوا اس نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، پانچویں اللہ تعالیٰ نے جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے ہجرت کی بعض نے تین ہجرتوں کا اور ذکر کیا ہے، جو یہ ہیں:

اوّل: حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ۔ کیونکہ صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف دو بار ہجرت کی تھی۔

دوم: ان افراد کی ہجرت جو دار الکفر میں مقیم تھے اور اپنے ایمان کے اظہار پر قادر نہ تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ دار الاسلام کی طرف ہجرت کریں۔

سوم: وہ ہجرت جو آخری زمانہ میں ظہورِ فتن کے وقت شام کی طرف ہو گی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت ہے جب کہ اہلِ اسلام سمٹ سمٹا کر مہاجر ابراہیم علیہ السلام (شام) میں جمع ہو جائیں گے اور زمین پر شریر افراد رہ جائیں گے (ابوداؤد)

صاحبِ نہایہ نے کہا: مہاجر ابراہیم علیہ السلام سے ملکِ شام مراد ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے شام چلے آئے تھے۔

حدیث فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔ اس کے معنیٰ

اس موقع پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے باب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں بظاہر معارض ہیں۔ مثلاً بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا (بخاری)

فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے اور جب امام تم کو کوچ کے لیے (جہاد کیلئے) بلائے تو اس کے ساتھ کوچ کرو۔

بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں:۔

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ الْيَوْمَ

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں یا

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (بخاری)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے عبید بن عمر نے ہجرت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا آج کے دن ہجرت نہیں اور مومن اپنے دین کو ساتھ لے کر اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرتے تھے تو خوف فتنہ کی وجہ سے کرتے تھے لیکن آج کے دن تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بلند فرما دیا ہے اور ایک مومن مسلمان اپنے رب کی

عبادت کرتا ہے جہاں چاہتا ہے اس لئے اب تو جہاد اور نیت ہی ہے ہجرت نہیں ہے (بخاری)

نیز بخاری و مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں ابی سعید کو ساتھ لیکر ہجرت پر بیعت کرنے کے لئے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا:۔

اِنْقَضَتِ الْهِجْرَةُ لِاَهْلِهَا (بخاری و مسلم) ہجرت ہجرت کرنے والوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

پھر آپ نے اسلام اور جہاد پر بیعت کی۔ انقطاعِ ہجرت کے مضمون کی احادیث امام احمد نے ابی سعید خدری، رافع بن خدیج اور زید بن ثابت سے بھی روایت کی ہیں۔ یہ تمام حدیثیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اب ہجرت منقطع ہے اور فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن ابوداؤد اور نسائی میں حضرت معاویہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہجرت منقطع نہ ہو گی جب تک توبہ کا دروازہ بند نہ ہو اور توبہ منقطع نہ ہو گی جب تک کہ آفتاب مغرب سے نہ نکلے۔ اسی طرح امام احمد نے ابن اسعدی سے اور جنادہ بن ابی امیہ سے مرفوعاً روایت کی جس کا مضمون یہ ہے کہ ہجرت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کافر مسلمانوں سے جنگ کرتے رہیں یا جہاد ہوتا رہے۔ یہ اور اس مضمون کی احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ہجرت فتح مکہ کے بعد بھی جاری ہے۔ شارحین نے اس تعارض کو اٹھانے کے لئے متعدد جواب دیئے ہیں۔

(۱) ابن الخطابی نے فرمایا کہ وہ ہجرت جو اوّل اسلام میں تھی وہ فرض تھی لہٰذا جن احادیث میں انقطاع ہجرت کا ذکر ہے اس سے مراد۔ یہی ہجرت ہے یعنی فرض ہجرت جو اول اسلام میں تھی وہ اب نہیں ہے اور فتح مکہ کے بعد جو ہجرت ہے وہ مستحب تھی۔ لہٰذا جن احادیث میں ہجرت کے جاری رہنے کا ذکر ہے اس سے اس سے مستحب ہجرت مراد ہے اور وہ جاری ہے۔

(۲) ابن اثیر نے فرمایا۔ ہجرت دو قسم کی تھی۔ ایک تو وہ کہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور آتے تھے اور مال واولاد سے قطع تعلق کر لیتے تھے (یعنی دین ہی کے ہو رہتے تھے) اور اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ بھی فرمایا تھا ایسی ہجرت (جس کے بدلہ میں جنت کا ملنا یقینی ہے) فتح مکہ کے بعد منقطع ہو گئی۔ دوسری ہجرت وہ ہے جو

اعراب کی تھی جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کرتے تھے اور اپنے وطن کو چھوڑتے تھے اور جیسے عمل اصحابِ ہجرت (صحابہ کرام) نے کئے وہ نہیں کر سکے۔ اس کے متعلّق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ ہجرت توبہ کے منقطع ہونے تک جاری ہے۔ علاّمہ عینی فرماتے ہیں ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہجرۃ باقیہ سے مراد ہجر السیئات ہو یعنی گناہوں کو ترک کرنا اور یہ ہجرت بلاشبہ قیامت تک جاری ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث اس مضمون کی ملتی ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہجرت دو قسم کی ہے۔ ایک تو گناہوں کو ترک کر دینا۔ دوسری اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرنا۔ اور ہجرت منقطع نہ ہوگی جب تک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا اور توبہ اس وقت تک قبول کی جائے گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے (احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں ایک اعرابی حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کی: حضور ہجرۃ کہاں پر ہے کس زمین پر ہے؟ کس قوم کے ساتھ خاص ہے۔ کیا آپ کے وصال کے بعد بھی ہجرت ہے؟ حضور علیہ السّلام نے کچھ دیر سکوت فرمایا۔ پھر فرمایا: جب تُو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے تو مہاجر ہے اگرچہ تو یمامہ کی زمین پر انتقال کرے۔ (احمد)

دُوسری روایت کے لفظ یہ ہیں:۔

اَلْهِجْرَةُ اَنْ تَهْجَرَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا	ہجرت یہ ہے کہ تو ظاہری اور باطنی برائیوں سے قطع
وَمَا بَطَنَ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ	تعلّق کرے۔ نماز قائم کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ پھر تُو
ثُمَّ اَنْتَ مُهَاجِرٌ (احمد)	مہاجر ہے۔

شارحین کے جوابات سے اس باب کی تمام حدیثوں میں تطبیق ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث میں بظاہر بھی تضاد نہیں ہے اور ہر حدیث اپنے موقع و محل پر بالکل صحیح اُترتی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ احادیثِ ہجرت پر غور کرنے سے پہلے ہجرت کے پس منظر کو دیکھنا چاہیئے۔

ہجرت کا پس منظر: یہ ہجرت جو حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے مدینہ کی طرف فرمائی اللہ عزّ و جلّ کے

خاص حکم کے مُطابق تھی۔ حضرت صدیق اکبر سے بھی حضور علیہ السّلام نے یہی فرمایا تھا کہ اب ہجرت کا حکم آ گیا ہے۔

(۲) اس ہجرت کا ذکر کُتبِ سماویہ میں بھی تھا چنانچہ وحی کی ابتدائی کیفیت جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ورقہ بن نوفل کو سنائی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ وہی ناموسِ اکبر ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا اور اے کاش! میں اس وقت تک زندہ رہ سکوں جب کہ آپؐ کی قوم آپ کو ہجرت پر مجبور کرے گی (۳) نیز سنّت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخری مُعجزۂ عذاب اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ پیغمبر کو مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم دیتا ہے۔ ایسی ہجرت ہر نبی نے کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نمرود کے ملک سے ہجرت کرتے ہیں "اِنِّیْ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ" حضرت موسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرتے ہیں پھر جب یہ ہجرت ہو لیتی ہے تو مُعجزۂ عذاب آتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر سوار نہ ہو لئے عذاب نہیں آیا۔ حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوط ہود۔ صالح۔ شعیب علیہم السلام جب تک اپنی اپنی قوموں کو لے کر الگ نہ ہو گئے۔ عذاب نہ آیا جب ان حضرات نے ہجرت کر لی تو اب عذاب نازل ہو گیا بعینہٖ اسی سنّتِ الٰہی کے مُطابق حضور علیہ السّلام کو بھی ہجرت کرنی پڑی۔ کفّار نے نہائی تنگ کیا۔ مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ دیئے طرح طرح کے معجزات طلب کئے تو اب وہ وقت آیا کہ کفّار پر عذاب نازل ہو۔ چنانچہ جب حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا تھا اور فرمایا تھا کہ اب قریش کی ہلاکت نزدیک آ گئی۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صہ ۲۱۶)

چنانچہ آیۂ قتال بھی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور بدر کی لڑائی بھی جو دراصل مُعجزۂ عذاب تھا جس میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو شکست ہوئی تھی اور جس کی تفصیل سورہ انفال میں ہے وہ بھی ہجرت کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔

بہر حال حضور علیہ السّلام نے مکّہ سے جو ہجرت فرمائی یہ سنّت اللہ کے مطابق تھی اور ہر نبی کو ایسی ہجرت کرنی ہوتی ہے

(۴) پھر اس ہجرت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہجرت کرنے والے انتہائی مُخلص تھے اور ان کو ہجرت پر برانگیختہ کرنے والی چیز رضا الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس امر کا اندازہ یوں بھی کیجئے کہ مکہ میں اسلام غریب تھا کفار نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ وطن اور مال و اولاد سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ پھر بظاہر ایسے حالات بھی نہ تھے جن سے یہ امید باندھی جائے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو غلبہ ہوگا مگر صحابہ کرام کا خلوص وللہیت دیکھئے کہ انہوں نے بغیر کسی دنیاوی لالچ اور طمع کے رسولِ کریم علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ وطن چھوڑا، مال و دولت، اہل و عیال، رشتہ دار سب کو رسول پر قربان کر دیا۔ ایسی خصوصیت والی ہجرت ایسے پاکیزہ نفوس کی ہجرت اور اس خلوص وللہیت کے ساتھ ہجرت واقع میں بے مثال ہجرت تھی۔ یہ ہجرت مقبول ہجرت تھی۔ اس کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے ان مہاجرین کی ہجرت کو قبول فرمایا اور اللہ تعالیٰ ان حضرات سے یقیناً راضی ہو گیا۔

پس ایسی ہجرت جس کے ثواب میں جنّت اور رضائے الٰہی کے حصول کا یقین ہے بلا شبہ فتح کے بعد ختم ہو چکی اور اب قیامت تک ایسی ہجرت نہیں ہو گی ایسی ہجرت کے متعلق حضورِ اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔

لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ   فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

یعنی یہ مخصوص ہجرت اب منقطع ہو چکی ہے البتہ ایسا ہوتا رہے گا کہ مسلمانوں کو ہجرت کرنی پڑے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسلام کے مقابلہ میں کفر موجود ہے مگر اس ہجرت کا حال یہ ہے کہ اگر خلوصِ نیت کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ہے تو ثواب ملے گا مگر اس دنیا میں اس کے متعلق قطعی حکم نہیں دیا جا سکتا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرما لیا۔ اس کے برعکس مکہ سے مدینہ والی ہجرت کے متعلق یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہے۔ لہٰذا جن احادیث میں یہ ارشاد ہے کہ فتح کے بعد ہجرت منقطع ہے اس سے مراد مکہ سے مدینہ والی ہجرت ہے جو اب نہیں ہے اور جن

احادیث میں ہجرت کے جاری رہنے کا ارشاد ہے وہ ہماری آپ کی ہجرت ہے جو جاری ہے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اگر احادیثِ ہجرت پر غور کیا جائے تو تضاد و اختلاف کے لفظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دُوسری توجیہ لَا ھِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ یہ مُراد لینا کہ فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کیلئے ہجرت شرعی ختم ہوگئی صحیح نہیں، حدیث ہذا پر غور کرنے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فتحِ مکہ سے قبل مدینہ چلے آنے والے مسلمان مہاجر سمجھے جاتے تھے اور ان کو ہجرت کا ثواب ملتا تھا۔ اس طرح اب فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آنے والے مسلمان مُہاجر نہیں سمجھے جا سکتے۔ کیونکہ اب مکہ و مدینہ دونوں دارالاسلام ہوگئے اور ہجرتِ شرعی کے اسباب و علل میں سے کوئی بھی سبب اب موجود نہیں رہا چنانچہ اگر حضور علیہ السّلام ایسا نہ فرماتے تو ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ فتح مکہ کے بعد بھی ثوابِ ہجرت حاصل کرنے کیلئے مدینہ ہجرت کرنے لگتے۔ تو ان کی تنبیہ و تفہیم کیلئے حضور علیہ السّلام نے فرمایا: اب فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے یعنی اب مکہ سے مدینہ آ رہنے والے افراد مہاجر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہجرت کی تعبدی نوعیت اور حقیقت کا تعلق مکہ اور مدینہ کے شہروں سے خاص نہیں ہے بلکہ ان خاص حالات سے ہے جن میں ہجرت ہوتی ہے اور یہ حالات کسی بھی ملک میں ہوں حکمِ ہجرت نافذ ہو جائے گا اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تو مکہ مدینہ سے بھی حکمِ ہجرت اٹھ جائے گا۔

ہجرت کے شرعی معنیٰ باعتبار لغت ہجرت کے معنیٰ ترک کے ہیں، حدیث میں بھی یہ لفظ ترک کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، مثلاً حضور علیہ السّلام نے فرمایا:۔

اَلْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنْہُ — مہاجر وہ ہے جو اس چیز سے رُک جائے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

اور اصطلاحِ شرع میں ہجرت یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنے شہر یا اقامت گاہ کو چھوڑ کر کسی

اور شہر یا ملک میں چلا جائے اور وہاں مقیم ہو جائے اکثر علماء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ یہ سفر دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہو مگر یہ قید ضروری نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس قید سے صحابہ کی ”پہلی ہجرت“ جو حبشہ کی طرف ہوئی معرضِ بحث میں آجائے گی اور دُور از کار تاویلیں کرنی پڑیں گی کیونکہ پہلی ہجرت جو حبشہ کی طرف ہوئی ”حبشہ“ اس وقت دارالاسلام نہ تھا۔ بہرحال علماء کی تفصیلی آراء کے مطالعہ کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ شرعی ہجرت میں یہ قید ضروری نہیں ہے کہ ہجرت دارالکفر سے دارالاسلام ہی کی طرف ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اسلامی ملک میں اہلِ اقتدار نظریات و عقائد کے لحاظ سے ایسے بگڑ جائیں کہ صحیح العقیدہ مسلمان کی زندگی وہاں دوبھر ہو جائے۔ وہ ملک اگرچہ اسلامی ملک ہی کہلاتا ہو مگر باوجود اس کے منکرات و فواحش کا زور ہو۔ اور اہلِ اقتدار کی طرف سے حق کہنے اور حق پر چلنے والے مستحقِ تعزیر ہوں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی صحیح العقیدہ مسلمان حمیت و غیرت میں صرف اپنے دین و ایمان کے سلامت لے جانے کی نیت سے اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو شرعاً یہ بھی ہجرت ہو گی اور انشاء اللہ العزیز اس پر بھی ثواب ملے گا (۲) اسی طرح فرض کیجئے کہ کسی دارالکفر سے مسلمان تنگ آکر ہجرت کرتا ہے اور جغرافیائی مصالح اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے کسی قریبی دارالکفر میں پہنچ سکتا ہے اور یہ دارالکفر باوجود دارالکفر ہونے کے اسلام کے حق میں اتنا جابر و ظالم نہ ہو کہ کسی مسلمان کیلئے رہنا ہی مشکل ہو جائے تو پہلے دارالکفر سے اس دارالکفر کی طرف حفاظتِ دین و ایمان کے لئے آجانا، ہجرتِ شرعی ہی ہو گا۔

اعمال و عقائد کی مقبولیت کا مدار خلوص نیّت پر ہے

واضح ہو کہ اسلام میں نیّت یعنی ارادہ قلبی ہر عمل کی بنیاد ہے۔ کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا نیّت کے لحاظ سے ہوتا ہے قرآنِ مجید نے نیت کا معاملہ بڑے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جگہ جگہ اخلاص اور حسنِ نیّت کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱- وَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (اعراف) اللہ کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو۔

۲- فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ (زمر) خدا کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو۔

۳۔ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آلِ عمران)	اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم دنیا ہی میں بدلہ دیں گے اور جو آخرت میں طالبِ ثواب ہو اس کو آخرت میں اجر عطا کریں گے۔
۴۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (نساء)	جو شخص دنیاوی اجر کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کے بدلے ہیں۔ اور اللہ تعالٰے سننے اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں سمیع و بصیر کے الفاظ اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ قادر قدیر خدا تمہارے دلوں کی آواز سننے والا اور پوشیدہ ارادوں کو جاننے والا ہے لہٰذا اگر عمل دنیاوی منفعت کی نیت سے کیا گیا ہے تو بس دنیا ہی میں اس کا بدلہ دے دیا جائے گا اور آخرت کا انعام تو صرف انہیں کے لئے ہے جو آخرت کے ارادہ سے نیک کام کریں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا کہ مومن کا ہمیشہ کیلئے جنّت میں داخلہ اس کے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ حُسنِ نیّت کی وجہ سے ہوگا کیونکہ عمل کا تقاضا تو صرف یہ ہے کہ اسی مقدار میں ثواب دیا جائے جتنا اس کا عمل ہے ظاہر ہے کہ انسان کے نیک اعمال کا وزن اور مدّت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بدلہ میں خلود فی الجنۃ کا انعام مل سکے۔ یہ خلود فی الجنۃ تو دراصل نتیجہ ہے مومن کے اس قصد و ارادہ کا کہ اگر اللہ نے مجھے ہمیشہ زندہ رکھا تو ہمیشہ اس کی خوشنودی کے لئے اس کی اطاعت کروں گا چونکہ عزم و ارادہ میں ہمیشگی پائی گئی ہے۔ اس لئے اس کے بدلہ میں خلود فی الجنۃ کا انعام دیا جائے گا۔

حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیّت درست رکھنے اور ریا و سمعہ سے بچنے کی ترغیب کے لئے متعدّد اسالیب اختیار فرمائے، کہیں فرمایا، مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ کہیں فرمایا جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا دکھاوے کو صدقہ دیا شرک کیا۔ کہیں فرمایا سب سے زیادہ خطرناک چیز جس سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔ پوچھا گیا کہ حضور! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا قیامت کے دن جب

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کی جزا و سزا دے گا تو دکھاوے کی نیت رکھنے والوں سے فرمائے گا انہیں کے پاس جاؤ جنہیں دکھانے کے لئے تم نے فلاں فلاں عمل کیا تھا دیکھیں! ان کے پاس تمہیں دینے کیلئے کیا ہے؟ کہیں فرمایا جس نے نیک کام کرنے کا ارادہ کیا اور پھر نہ کر سکا تو محض نیت پر ثواب ملے گا۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ میرا ایک صحابی ایک مد یا نصف مد اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے اور تم (غیر صحابی) سونے کا ایک پورا پہاڑ راہِ خدا میں دے دو تب بھی صحابی کے ایک مد کی برابری نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ سونے کے ایک پورے پہاڑ کے مقابلہ میں ایک مد کی حیثیت ہی کیا ہے مگر چونکہ اعمال میں بنیادی اہمیت نیّت کی ہے اور اخلاص و نیّت میں کوئی بھی صحابی کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس لئے صحابی کا تھوڑا عمل بھی ہمارے بڑے بڑے نیک عملوں کے مقابل عند اللہ کہیں ارفع و اعلیٰ ہو گیا۔

پھر خلوصِ نیّت کا تعلق صرف اعمال ہی سے نہیں ہے بلکہ خیالات و جذبات، افکار و معتقدات کے مفید و مقبول ہونے کے لئے خلوصِ نیّت کی ضرورت ہے اگر ہم کسی سے بدگمان ہیں یا اس کے مخالف ہیں تو یہ دیکھا جائے گا یہ مخالفت آیا اس لئے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے اور اس جیسے لوگوں سے اللہ نے بدگمانی رکھنے کا حکم دیا ہے، یا یہ بدگمانی اور مخالفت اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قطع نظر ہمیں کسی گروہ کا ساتھ دینا ہے۔ کسی شخص کی خوشنودی سے اپنے نفس کی تسکین مقصود ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو بے شک ہماری بدگمانی اور مخالفت نہ صرف حق ہے بلکہ اس پر ثواب کی اُمید بھی ہے اور اگر دوسری صورت ہے تو یقیناً ہماری یہ مخالفت و بدگمانی گناہ ہے، اس لئے ہر عمل، ہر عقیدہ اور ہر جذبہ کو جانچ کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی تہ میں کس حد تک رضائے مولا کی طلب کارفرما ہے اور کس حد تک کوئی اور جذبہ۔

فسادِ نیّت کا انجام ۔ یہی وجہ ہے کہ فسادِ نیّت کے باعث بہتر سے بہتر اور افضل سے افضل عمل کرنے والے قیامت کے دن منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور ان کے اعمالِ خیر ان کے لئے وبالِ جان ہو جائیں گے۔ مسلم شریف میں ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ فَاُتِيَ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذِبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيٌّ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ وَقَرَءَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَاْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذِبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ كَذِبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن لوگوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب سے پہلے کریگا، ان میں سے ایک شخص تو وہ ہوگا جسے اللہ کی راہ میں شہید کیا گیا۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ فرمائیگا یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں وہ جواب دیگا بے شک دی تھیں، اللہ کہے گا پھر تُو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا میں تیری خاطر لڑا۔ یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے میری خاطر تُو کہاں لڑا بلکہ تُو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں پس لوگوں نے بہادر کہا۔ اور تجھے تیرا انعام ملگیا پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم صادر فرمائے گا اور اسے منہ کے بل کھینچکر آگ میں ڈال دیا جائے گا — اور ایک شخص وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھلایا اور قرآن پڑھا، یہ لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کہے گا یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں۔ وہ کہے گا بے شک دی تھیں اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھر تُو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں تک پہنچایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا اور اللہ فرمائے گا تُو جھوٹا ہے علم تُو نے اس لئے سیکھا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہا کریں اور تلاوتِ قرآن اس لئے کی تھی کہ لوگ تجھے قاری کہیں۔

قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم)

پس انہوں نے کہا (اور تیرا اجر تجھے مل گیا) پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم صادر کرے گا اور اسے منہ کے بل کھینچکر آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور ایک شخص وہ ہوگا جس پر اللہ نے روزی کشادہ کی اور ہر قسم کا مال ومتاع اسے عطا کیا یہ لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں۔ وہ کہے گا بیشک دی تھیں۔ اللہ کہے گا پھر تُو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا میں نے ہر اس راہ میں مال خرچ کیا جس میں خرچ کرنا آپ پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تُو دروغ گو ہے میری پسند کے خیال سے کہاں، تُو نے تو اسلئے مال خرچ کیا کہ لوگ تجھے سخی کہا کریں۔ پس انہوں نے کہا (اور تیرا اجر تجھے مل گیا) پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم صادر کرے گا اور اسے منہ کے بل کھینچکر آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم)

غور تو کیجئے! جہاد جیسا عظیم عملِ خیر، شہادت جیسی جلیل القدر نعمت، تعلیم وتعلّم جیسا پاکیزہ مشغلہ، صدقہ وخیرات جیسا نفیس کام اللہ کی خوشنودی کی بجائے دُنیا کی ناموری اور شہرت کے جذبہ نے مٹی کر دیا، صرف اتنی سی بات پر کہ دل کے اندر بہادر کہلانے کا شوق تھا، عالم مشہور ہونے، قاری اور سخی پکارے جانے کی تمنا تھی۔ سب کچھ اکارت گیا اور آگ میں جلنا پڑا۔

اس لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اعمال کا مدار نیّت پر ہے اور تمام اعمال وعقائد، جذبات وخیالات کا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ان کی تہ میں حد درجہ کا خلوص اور رضائے الٰہی کے حصول کی خالص نیّت کارفرما ہو۔ نیّت کی مثال بیج کی طرح ہے اور اعمال وافعال گویا زمین میں جوتنے اور پانی دینے کے درجہ میں ہیں۔ ہم عمل تو کریں دنیا کو دکھانے کے لئے اور امید رکھیں انعام آخرت سے نوازے جانے کی تو یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے بوئیں تو تھوہر اور نیم کے بیج اور اُمید لگائیں کھجور اور آم کے پیدا ہونے کی۔

(۳) زیرِ تفہیم حدیث سے مُتعلّق یہ امر بھی قابلِ وضاحت ہے کہ جب حدیث میں "الی دنیا" آگیا تو اس میں عورت بھی آگئی۔ پھر "الی امرأۃ" فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ علامہ قسطلانی ودیگر شارحین کرام

نے جواب دیا چونکہ عورت ہی سب سے زیادہ دُنیا میں فتنہ و مصیبت کا سبب بنتی ہے لہٰذا تخصیص بعد التعمیم کے طور پر اسے خصوصیت سے ذکر کر دیا جیسا کہ قرآنِ کریم میں ملائکہ کے لفظ کے بعد جبریلؑ کا ذکر آیا ہے۔

اور حدیث میں حضور علیہ السّلام نے فرمایا:۔

مَا تَرَكْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے
مِنَ النِّسَآءِ (عینی جلد ۱ صـ ۳۴) بڑھ کر فتنہ انگیز چیز کوئی نہیں چھوڑی۔

تو اگرچہ لفظ دُنیا میں عورت آگئی تھی مگر خصوصی تنبیہ کے طور پر عورت کا پھر ذکر فرما دیا نظاہر ہے یہ توجیہ یک طرفہ ہے اور سوال تو پھر بھی باقی رہتا ہے کیونکہ دُنیا میں جو چیز فتنہ و مصیبت کا سبب بنتی ہے وہ صرف عورت ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مال و دولت' اولاد بھی ہے جس کا ذکر خود قرآنِ حکیم نے کیا ہے پھر عورت مطلقاً ایسی چیز نہیں ہے جو فتنہ و فساد کی جڑ ہے۔ حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ عورت صالحہ ہو تو دنیا کی بہترین متاع ہے اور یہ بھی کہ اَلدُّنْیَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْءَةُ الصَّالِحَةُ دُنیا پوری کی پوری سرمایہ ہے اور اس سرمایہ کا سب سے بہتر حصہ صالحہ عورت ہے۔

بعض شارحین نے یہ جواب دیا کہ یہ حدیث مہاجر ام القیس کے متعلّق آئی۔ مدینہ میں قیلہ نامی ایک عورت تھی جن سے ایک صاحب نے نکاح کرنا چاہا تو قیلہ نے کہا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آؤ تو نکاح منظور ہے چنانچہ انہوں نے ہجرت کر کے نکاح کر لیا۔ لوگ انہیں مُہاجرِ ام القیس کہنے لگے لہٰذا حضور پُرنُور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کے طور پر خصوصاً عورت کا ذکر بھی فرما دیا۔

اب رہی یہ بات کہ عملِ مخلوط یعنی ایسے عمل کا کیا حکم ہے جس میں دین و دُنیا دونوں کی غرضیں مل جُل گئی ہوں۔ مثلاً ایک شخص حج کے لئے جاتا ہے اور تجارتی منفعت کا بھی کوئی پہلو اس کے پیشِ نظر ہے تو ثواب ملیگا یا نہیں۔

واضح ہو کہ اصطلاحِ شرع میں خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے کو نیّت کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

بعض وہ اعمال و افعال جو عبادت نہیں ہیں۔ اگر ان کے کرنے والا قربۃ کی نیت کرے تو ان پر بھی ثواب ملتا ہے چنانچہ عمل کی چند صورتیں ہیں :۔

عمل کا باعث اور اصل مُحرّک صرف دُنیا ہے تو ثواب نہیں ملے گا ۔

عمل کا باعث تو صرف اُخروی ہے ۔ مگر ضمناً کوئی دُنیوی منفعت بھی ملحوظ ہے تو یہ عمل عبادت ہی سمجھا جائے گا البتہ یہ ضرور ہے کہ جس نسبت سے دنیاوی نیّت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب میں کمی ہوجائے گی ۔

پھر اس میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد جو عبادت کے ساتھ ملایا گیا وہ حلال ہے یا حرام ۔ اگر حرام ہے تو عمل ضائع ہوجائے گا اور اگر حلال ہے تو بقدرِ نیّت دنیاوی ثواب کم ہوکر ملے گا ۔

اور اگر عمل کا اصل مُحرّک صرف رضائے الٰہی ہے اور ضمناً بھی کوئی دنیاوی منفعت ملحوظ نہیں ہے تو عمل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور ثواب کامل اس پر دیا جائے گا۔ اب ان کی مثالیں لیجئے ۔

ایک شخص حج کے لئے روانہ ہوا، عزم و ارادہ تو فریضہ حج کی ادائیگی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ موقع ملا تو تجارت بھی کروں گا اور عزیز و اقارب سے بھی مل لوں گا تو اس کا یہ فعل عبادت ہی قرار پائے گا ۔

قرآن حکیم میں اس کے متعلق فرمایا :۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل
تلاش کرو۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے خیال کیا کہ راہ حج میں جس نے تجارت کی اس کا حج ہی کیا۔ اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ راہِ حج میں تجارت کرنا مباح ہے جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عمل مخلوط میں یہ دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد حرام ہے یا حلال ۔ اگر حرام ہے تو عمل بھی ضائع ہوجائے گا۔ جیسے حج کرنے والا یہ نیت بھی کرے کہ حج کر کے حاجی کہلاؤں گا اور دوسروں کی نگاہ میں عزت وجاہ حاصل کروں گا تو چونکہ ریاء و سمعہ حرام ہے ۔ اس لئے یہ حج بھی ضائع ہوجائے گا اور اگر دوسرا قصد حلال ہے بقدر

حصہ ثواب مل جائے گا مثلاً حج ہی کو لیجئے کہ نیت تو حج کی ہے مگر اس کے ساتھ تجارت کا بھی خیال ہے تو تجارت چونکہ حلال ہے اس لئے ثواب حج ملے گا مگر چونکہ اس میں تجارت کی نیت بھی ہے تو جس نسبت سے دنیاوی نیت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب کم ہو کر ملے گا۔ بہرحال یہ نیت کا معاملہ ایسا ہے کہ عمل میں جس قدر زیادہ خلوص ہو گا اسی قدر ثواب میں زیادتی ہوگی اور خلوص میں جس قدر کمی ہوگی ثواب میں بھی کمی ہو جائے گی اور سب سے برتر و بالا عمل وہی ہے جس میں شروع سے لیکر اخیر تک حسن نیت یکساں قائم رہے اور ضمناً بھی کسی دنیاوی منفعت کا خیال تک نہ آئے۔

حدیث الاعمال بالنیّۃ کے چند اہم فوائد و مسائل

یہ حدیث حسب ذیل فوائد و مسائل پر مشتمل ہے: اس میں شریعت کے اس ضابطہ کا بیان ہے کہ اعمال خواہ وہ فرائض ہوں یا واجبات مستحبات ہوں یا مباحات ان کا ثواب اسی وقت ملیگا جب کہ نیت صالح ہو۔ نیز یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس حدیث میں اعمال سے کوئی خاص عمل مراد نہیں ہے لہٰذا اس میں وہ عمل بھی داخل ہے جس کے متعلق شریعت نے نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ اس سے منع کیا ہے یعنی مباح۔ تو اب اس اصول کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر وہ کام جو مباح ہوا اور جس کے کرنے پر ثواب بھی مقرر نہ ہو اگر اسی کام کو آدمی نیت خیر کے ساتھ کرے تو وہ عبادت ہو جائے گا اور اس کا ثواب ملے گا چنانچہ علامہ عینی علیہ الرحمہ اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:-

وَفِیْہِ الحَثُّ علیٰ نِیَّۃِ الخَیْرِ مُطْلَقًا وَاِنَّہٗ یُثَابُ عَلَی النِّیَّۃِ۔

اس حدیث میں نیتِ خیر کی ترغیب دی گئی ہے مطلقاً اور یہ کہ آدمی کو اس کے عمل کا ثواب نیت کی وجہ سے مل جائے گا۔ (عینی جلد اول ص ۳۶۵)

(۲) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ احادیث میں آیا ہے جب ملائکہ بندوں کے اعمال آسمانوں پر لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْقِ تِلْکَ الصَّحِیْفَۃَ

اس صحیفہ کو پھینک دو یعنی یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔ فرشتے عرض کریں گے الٰہی اس بندے نے نیک کام کئے ہم نے سنے اور دیکھے اور لکھ لئے ان کو کیسے پھینک دیں حکم ہوگا لَمْ یُرِدْ بِہٖ وَجْھِی چونکہ اس بندے نے اس عمل کے ساتھ میری رضا کا ارادہ نہیں کیا اس لئے یہ میرے حضور میں مقبول نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے فرشتے کو حکم ہوگا اکتب لفلان کذا وکذا فلاں بندے کے اعمال نامہ میں فلاں فلاں عمل لکھ دے۔ فرشتہ عرض کریگا الٰہی یہ کام تو اس نے کیا نہیں؟ ارشاد ہوگا کہ وہ کر نہیں سکا مگر اس کا ارادہ اور نیّت تو اس کام کے کرنے کا تھا۔ دیکھئے نیّتِ صالح سے عمل کے بغیر ہی ثواب مل گیا اور بُری نیّت سے کئے ہوئے اعمال ضائع ہو گئے۔

(۳) حضرت **رومی** علیہ الرحمۃ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے مسجد کے پاس اپنا مکان بنایا اور مسجد کی طرف ایک کھڑکی رکھ لی، اس کے پیر نے پوچھا یہ کھڑکی کیوں رکھی ہے۔ جواب دیا ہوا کے لئے۔ آپ نے فرمایا اگر تو یہ نیت کرتا کہ کھڑکی اس لئے رکھتا ہوں کہ اذان کی آواز یا جماعت کے کھڑے ہو جانے کا علم ہو جایا کرے تو ہوا خود بخود آجایا کرتی اور تجھے تیری نیّت کا ثواب ملتا۔

(۴) غریب کی مدد کرنا کارِ ثواب ہے۔ قرآن وحدیث نے اس عمل پر ثواب مقرر کیا ہے تو اب اگر کسی ایسے غریب کی مدد کرے جو اس کا رشتہ دار ہے اور نیّت یہ کرے کہ غریب رشتہ دار کو دینے میں صلہ رحمی بھی ہے تو تو ایسی صورت میں تعدّدِ نیّت کی وجہ سے اس کو دو ثواب مل جائیں گے۔ ایک صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا۔

(۵) نماز پڑھنا کارِ ثواب ہے لیکن آپ ایک ایسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں جو ویران ہے اور آپ کی نیت یہ ہے کہ اس ویران مسجد میں جب نماز پڑھوں گا تو میری وجہ سے اور لوگ بھی یہاں آئیں گے اور مسجد آباد ہو جائے گی یہاں بھی تعدّدِ نیّت کی وجہ سے ڈبل ثواب ملے گا ایک نماز کا۔ دوسرے مسجد آباد کرنے کا۔

(۶) مسجد میں بیٹھنا ایک عمل ہے اگر اس کے ساتھ اعتکاف کی نیت کرے تو ثوابِ اعتکاف مل جائے گا۔ پھر اعتکاف کے ساتھ یہ نیّت بھی ہو کہ جماعت کا انتظار ہے تو بحکم حدیث جماعت کا منتظر نماز میں ہے نماز کا ثواب

بھی ملے گا۔ پھر اس کے ساتھ یہ نیت کرے کہ جتنی دیر مسجد میں ٹھہروں گا تمام اعضا، کی جملہ برائیوں سے حفاظت ہوگی تو یہ ثواب بھی مل جائے گا۔ اسی طرح اس کے ساتھ درود شریف پڑھنے کی نیّت کرے یا یہ نیّت کرے کہ مسجد میں علم کا اِفادہ یا استفادہ ہوگا یا کوئی دینی بھائی مل جائے گا اس کی زیارت کروں گا یا کوئی سلام کہے گا اُس کو جواب دوں گا۔ کسی کو چھینک آئے گی تو یَرْحَمُكَ اللّٰه کہوں گا الغرض جتنی نیّتیں کریگا سب کا ثواب مل جائے گا۔ دیکھئے کام ایک ہی ہے مگر نیّتیں متعدّد ہیں اور نیّتوں کا الگ الگ ثواب مل رہا ہے کیونکہ حدیث بالا کے الفاظ لِكُلِّ امْرَءٍ مَا نَوىٰ کا یہی مطلب ہے کہ جو نیّت کرے گا وہی پائے گا۔

(۷) ایک شخص اپنی ضرورت سے بازار جا رہا ہے۔ بازار جانا ایک مُباح عمل ہے لیکن اگر وہ اس میں یہ نیّت کرلے کہ رستہ میں جو تکلیف دِہ چیز ہوگی اس کو ہٹا دوں گا۔ اسلام کی اشاعت کروں گا کسی کو بُرا کام کرتے دیکھوں گا تو منع کروں گا۔ کسی مسلمان بھائی کو خوش کرنے کے لئے مُسکرا دوں گا۔ جتنی نیّتیں کرے گا سب کا الگ الگ ثواب مل جائے گا اور یہ بازار جانا کارِ ثواب ہوجائے گا۔ پھر لطف یہ کہ ارادہ تو ان امور کے کرنے کا کرلیا مگر نہ کرسکا تو بھی ثواب مل جائے گا۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ اَبْلَغُ مِنْ عَمَلِهٖ کہ مومن کی نیّت اس کے عمل سے زیادہ معتبر ہے۔

غرض اس حدیثِ مُبارکہ سے یہ اصول نکلتا ہے کہ ہر وہ کام جس کی ممانعت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی جب وہ نیک نیتی سے کیا جائے تو وہ کام عبادت ہوجائے گا اور اس پر ثواب ملے گا۔

چنانچہ اس اُصول کی روشنی میں اگر دیانت داری سے مسائل کی حیثیت دیکھی جائے تو بہت سے ایسے مسائل حل ہوجاتے ہیں جن میں آج بحث و مباحثہ، مکابرہ و مجادلہ کا بازار گرم ہے۔

مثلاً مجلس میلاد کے قیام و اہتمام کو لیجئے۔ اگر نیت یہ ہے کہ حضور سیّد عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ظاہر ہو آپ کے فضائل و مناقب بیان ہوں اور آپ کی سیرت مبارکہ قوم کے سامنے رکھی جائے تو اس حدیث کی رو سے جائز ہے اور کارِ ثواب ہے۔ اگر مجلس میلاد کے قیام کی غرض ریا و سمعہ ہو یا اس کو فرض و واجب سمجھ لیا جائے اور یہ خیال

کیا جائے کہ صرف ربیع الاوّل کی ۱۲ تاریخ کو ہی یہ مجلس قائم ہو سکتی ہے اور دنوں میں ذکر رسول ہو ہی نہیں سکتا یہ نیت غلط ہے اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے۔

یا مثلاً میت کے تیسرے۔ ساتویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر مساکین کو کھلایا جائے اور نیت یہ ہو کہ دن مقرر کرنے میں آسانی ہوتی ہے مساکین جمع کر لئے جاتے ہیں تو حدیث ہذا کی روشنی میں اس کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ اگر نیت یہ ہو کہ دن مقرر کر کے ہی فاتحہ دینے میں ثواب پہنچتا ہے ویسے نہیں یا کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینا ضروری ہے تو اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے اور بتا دینا چاہیئے کہ ثواب پہنچانے کے لئے دن مقرر کرنا ضروری نہیں ہے جس روز بھی ایصال ثواب کیا جائے خواہ کھانا پکا کر غربا میں تقسیم کیا جائے یا قرآن پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچایا جائے ہر طرح جائز ہے۔ ہاں اگر ان قیود میں کوئی مصلحت ہو تو حرج نہیں کیونکہ اعمال کا مدار نیت پر ہے

اسی طرح میت کے دفن کے بعد لوگ جمع رہتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ بیکار بیٹھے رہنے اور فضول گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ کلمہ طیبہ جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ افضل الذکر یہی ہے پڑھتے رہیں تو یقیناً موجب برکت ہے پھر اگر بعض روایات کے مطابق ستّر ہزار بار ہو جائے اور میت کو بخشا جائے تو امید مغفرت ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی رو سے ضرور ان کو اجر ملے گا اور پھر وہ میت کو بخشیں گے تو ضرور میت کو پہنچیگا کیونکہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور جب اعمال کا مدار نیت پہ ہے تو اب مذکورہ بالا کام کرنے والوں کو جب کہ انکی نیت حسن ہے بدعتی کہنا اور جاہلوں کو یہ کہہ کر مغالطہ دینا کہ کیا یہ کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا کیسا فضول اعتراض اور کس قدر جہالت کی بات ہے۔ بہرحال دیانت و امانت ہو اور نفسانیت وہٹ دھرمی نہ ہو تو اس قسم کے بہت سے مختلف فیہ مسائل اسی حدیث کی روشنی میں حل ہو جاتے ہیں۔ فافہم

ایمان کے اثرات وثمرات

کتابِ مجید میں ایمان کے نتائج وثمرات اور ایمان داروں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں ایسے ہی قرآنِ مجید کے شارح حضور سیّدِ عالم نورِ مجسم صلے اللہُ علیہ وسلم نے بھی ایمان کے نتائج وعلامات کو بیان فرمادیا ہے۔ جناب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَۃً وَّالْحَیَاءُ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیا بھی ایمان کا
شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (بخاری) ایک شعبہ ہے۔

بِضع کے لفظ کا استعمال تین سے لیکر نو تک ہوتا ہے **شُعْبَۃٌ**: ش کے زیر، زبر، اور پیش تینوں طرح پڑھنا جائز ہے اس کے معنیٰ ٹکڑے کے ہیں۔ **شعب** درخت کی ٹہنیوں اور ہڈّی کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس کے معنیٰ خصلت کے ہیں یعنی ایمان کی متعدّد علامتیں اور خصلتیں ہیں (۲) ظاہر ہے کہ ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں اور اس حدیث میں فرع پر ایمان کا اطلاق بطورِ مجاز کیا گیا ہے کیونکہ اعمالِ صالحہ ایمان کی علامتیں ہیں۔ بعض احادیث میں بِضع وَسَبْعُوْنَ کا لفظ بھی آیا ہے۔ یعنی ایمان کی کچھ اوپر ستّر شاخیں ہیں۔ لیکن اس تعداد سے مُراد حصہ نہیں ہے کہ ایمان کی صرف اتنی ہی شاخیں ہیں بلکہ مُراد تکثیر ہے یعنی ایمان کی کثرت سے شاخیں اور خصلتیں ہیں (۳) حیا انسان کی ایک فطری صفت ہے اور اس سے وہ حیا مُراد ہے، جو انسان کو بُرائیوں سے روکے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے پُوری حیا، کرنے کا مطلب یہ ہے:۔

اَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا حَوٰی وَالْبَطْنَ سر اور خواہشات اور پیٹ اور اسکے اندر جو ہے اس کی
وَمَا حَوٰی وَتَذْکُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰی حفاظت کر اور بلا ومصیبت کو یاد رکھ۔

علما، کی ایک جماعت نے ایمان کے کچھ اوپر ستّر ثمرات و اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے مثلاً شیخ عبدالجلیل نے اپنی تصنیف "**شعب الایمان**" میں اسحاق بن قرطبی نے کتاب النصائح" یں امام ابوحاتم نے اپنی کتاب "وصف الایمان" میں امام ابوعبداللہ حلیمی نے اپنی کتاب "فوائد لمنہاج" میں اور امام حافظ بیہقی نے مختصر شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کے ان ستّر ثرات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ علّامہ عینی نے اختصار کے ساتھ اثراتِ ایمان کی تفصیل اس طرح یان کی ہے، ایمان تصدیقِ قلبی و اقرارِ لسانی کا نام ہے مگر نجات کامل کے لئے تصدیق اقرار اور عمل الح کی ضرورت ہے۔ یہ تین قسمیں ہوئیں:۔

اوّل: اعتقادات: اس کے تین شعبے ہیں: (۱) ایمان باللہ۔ اس میں توحید اور خدا کی ذات و فات بھی شامل ہیں (۲) یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے حادث ہے (۳) فرشتوں پر ایمان (۴) سولوں پر ایمان (۵) کتبِ سماویہ پر ایمان (۶) ملائکہ پر ایمان (۷) تقدیر پر ایمان (۸) یومِ آخرت پر ایمان۔ اس میں وال قبر، عذابِ قبر، بعث و نشور، حساب، میزان و پل صراط پر ایمان لانا بھی داخل ہے (۹) جن کے لئے اللہ الیٰ نے جنّت یا نار کا وعدہ فرمایا ہے اس پر ایمان لانا اور وعیدِ نار پر ایمان لانا (۱۰) اللہ سے محبت کرنا (۱۱) اللہ الیٰ کے لئے کسی سے محبّت کرنا اور عداوت رکھنا۔ اس میں صحابہ کرام، مہاجرین و انصار اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ لم کی محبّت بھی داخل ہے (۱۲) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کرنا اس میں نماز اور اتباعِ سنّتِ نبوی خل ہے (۱۳) اخلاص۔ اس میں ریا اور نفاق کا ترک بھی شامل ہے (۱۴) توبہ (۱۵) خوفِ الٰہی (۱۶) خدا ے امید (۱۷) خدا سے کسی حال میں ناامید نہ ہونا (۱۸) شکر (۱۹) وفا (۲۰) صبر (۲۱) تواضع ۲) بڑوں کا ادب کرنا (۲۳) تقدیر پر راضی رہنا (۲۴) توکّل (۲۵) رحمت و شفقت۔ اس میں چھوٹوں رحم کرنا بھی داخل ہے (۲۶) عصب کا ترک کرنا (۲۷) بدگمانی سے بچنا (۲۸) عُجب و تفاخر سے پرہیز نا (۲۹) ترک الحقد (۳۰) حُبِّ دنیا کا ترک۔ اس میں حُبِّ مال اور جاہ شامل ہے۔

دوم : وہ جن کا تعلّق زبان سے ہے اس کے ۶ شعبے ہیں (۱) زبان سے توحید کا اقرار کرنا (۲) قرآنِ پاک کی تلاوت (۳) علمِ دین کی تعلیم دینا (۴) دُعا (۵) ذکرِ الٰہی اس میں استغفار بھی داخل ہے (۶) لغو سے پرہیز کرنا

سوم : بدن کے اعمال اس کے چالیس شعبے ہیں اور پھر ان کی تین نوع ہیں۔ **اوّل** : وہ جن کا اعیان سے تعلق ہے۔ اسکے ۱۶ شعبے ہیں (۱) پاکی۔ اس میں بدن، کپڑا، مکان کی طہارت۔ وضو غُسلِ جنابت و حیض و نفاس بھی شامل ہے (۲) اقامۃ الصلوٰۃ۔ اس میں فرض نفل اور قضا داخل ہے (۳) صدقہ۔ اس میں ادائے زکوٰۃ۔ صدقۂ فطر، جُود و کرم، کھانا کھلانا اور مہمان کی تکریم بھی شامل ہے (۴) صوم اس میں فرضی نفلی روزے داخل ہیں (۵) حج۔ اس میں عمرہ بھی داخل ہے (۶) اعتکاف۔ اس میں لیلۃ القدر کا قیام بھی داخل ہے (۷) دینی وجہ سے ہجرت کرنا (۸) نذر پوری کرنا (۹) غلاموں کو آزادی دلانا (۱۰) کفّارہ ادا کرنا (۱۱) نماز اور خارجِ نماز میں سترِ عورت (۱۲) قربانی کرنا (۱۳) القیام بامرِ الجنائز (۱۴) قرض ادا کرنا (۱۵) معاملات میں سچائی کو اختیار کرنا اور سُود سے بچنا (۱۶) حق کی شہادت دینا اور اس کو نہ چھپانا۔

دوم : وَمَا یَخْتَصُّ بِالْاِتِّبَاعِ اس کے چھ شعبے ہیں (۱) نکاح کے بعد زنا سے بچنا (۲) اہل و عیال کے حقوق ادا کرنا۔ اس میں خادموں کے ساتھ نرمی کرنا بھی شامل ہے (۳) والدین سے نیک سلوک کرنا (۴) اولاد کی تربیت کا خیال رکھنا (۵) صلہ رحمی اختیار کرنا (۶) اپنے آقا کی اطاعت کرنا۔ **سوم** : وہ جن کا تعلّق عام لوگوں سے ہے اسکے اٹھارہ شعبے ہیں (۱) حاکم ہونے کی صورت میں عدل و انصاف کرنا (۲) سوادِ اعظم کے ساتھ رہنا (۳) نیک و صالح حاکموں کی اطاعت کرنا (۴) اِصلاح بین النّاس۔ اس میں قتالِ خوارج و بُغات داخل ہے (۵) نیکی پر تعاون (۶) اچھی باتوں کا حکم کرنا برائی سے روکنا (۷) حدود کو قائم رکھنا (۸) راہِ خدا میں جہاد کرنا (۹) امانت کو ادا کرنا (۱۰) قرض وعدہ پورا کرنا (۱۱) ہمسایہ کی عزّت کرنا (۱۲) معاملہ کی صفائی (۱۳) اسراف و تبذیر سے بچنا (۱۴) سلام کا جواب دینا (۱۵) چھینک کا جواب دینا (۱۶) رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصّہ لینا (۱۷) لہو و لعب سے پرہیز کرنا (۱۸) راستہ سے ایذا دینے والی چیز کو ہٹانا۔ یہ ۷۷ شعبے ہیں جو ایمان کے اثرات و نتائج ہیں (عینی جلد ۱ ص ۱۵۲)

نفاق اور اُس کے معنیٰ و مفہوم کی وضاحت

حضور سیّدِ عالم نُورِ مجسّم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

قَالَ اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری)

مُنافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

حدیث ہذا میں منافق کی تین خصلتوں کا ذکر ہے جو قول اور عمل اور نیّت سے متعلق ہیں۔ کذب فسادِ قول ہے خیانت فسادِ عمل ہے اور عہد شکنی فسادِ نیّت ہے۔ (۱) اس پر اجماع ہے کہ اگرچہ یہ امور علاماتِ نفاق ہیں لیکن اس کے باوجود کسی مومن مخلص میں یہ علاماتِ نفاق جمع ہو جائیں تو اس کو کافر یا مُنافق نہیں کہا جائے گا۔ (۲) علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث ہذا میں منافق کی خصلتوں کا ذکر ہے تو اگر یہ عادتیں مومنِ صادق میں پائی جائیں تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس میں مُنافقانہ عادتیں پائی گئیں۔ لیکن یہ نہیں کہیں گے کہ وہ مومنِ صادق منافقِ حقیقی ہو گیا۔ (۳) علامہ قرطبی نے فرمایا: نفاق دو قسم پر ہے عملی اور اعتقادی۔ نفاقِ اعتقادی یہ ہے کہ آدمی زبان سے اسلام کا اظہار کرے اور دل میں کفر کو چھپائے یعنی دل سے اسلام کا منکر و مخالف ہو۔ یہی وہ نفاق ہے جو ذلیل ترین قسم کا کفر ہے اور جس کے متعلق قرآن حکیم نے کہا :۔ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ منافق ہی فاسق ہیں یعنی دین سے خارج ہیں اور نفاقِ عملی یہ ہے جیسے کذب، خیانت، بدعہدی ایسے خصائل تو اس حدیث میں نفاقِ عملی کا بیان ہے کہ جس شخص میں مذکورہ بالا خصلتوں میں سے کوئی خصلت پائی گئی تو اس میں نفاقِ عملی پایا گیا۔ گویا ایک نفاق تو ایمان و عقیدہ کا نفاق ہے جو بدترین قسم کا کفر ہے لیکن اس کے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا مُنافقوں والی سیرت

ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے مگر وہ عقیدے کا نہیں بلکہ سیرت و کردار کا نفاق ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حذیفہ سے پوچھا تھا کہ کیا تم مجھ میں نفاق پاتے ہو تو اس سے ان کی مراد نفاقِ عملی کے متعلق سوال تھا اعتقادی کے متعلق نہیں۔

بعض شارحین نے یہ کہا کہ حدیثِ ہذا کا تعلق زمانۂ نبوّت کے مخالفین سے ہے جو اسلام کے دعویٰ میں جھوٹے تھے دین میں خیانت کرتے تھے جو عہد کرتے اس کو پورا نہ کرتے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس و ابن عمر و سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم و حضرت عطار و رباح، حسن بصری و اکثر شراحِ حدیث کی یہی رائے ہے اور اس سلسلہ میں حضرت سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ حضرت ابن عباس و ابن عمر نے حضور علیہ السلام سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ یہ جو میں نے فرمایا ہے جب بات کرے جھوٹ بولے، اس کا بیان اس آیت میں ہے اِذَا جَآءَ الْمُنَافِقُوْنَ ۔ ۔ ۔ الخ اور یہ جو میں نے فرمایا جب وعدہ کرے اس کا خلاف کرے اس کا بیان اس آیت میں ہے وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ اور یہ جو میں نے فرمایا ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے تو اس کا بیان اس آیت میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔۔۔۔ الآیہ۔ تو ہر آدمی دین کا امین ہے اور ظاہر و باطن نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے لیکن منافق صرف ظاہری طور پر نماز پڑھتا ہے تو کیا تمہاری بھی یہی حالت ہے۔ ہم نے عرض کی نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

لَا عَلَيْكُمْ اَنْتُمْ مِنْ ذٰلِكَ بَرِيٌّ ” (عینی جلد ۱ صفحہ ۲۵۹) یہ تمہارے متعلق نہیں ہے تم اس سے بری ہو۔

تو گویا مطلبِ حدیث یہ ہوا کہ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے منافقوں کی نشانیاں بتائی ہیں کہ ان میں خیانت، کذب، عہد شکنی، بدزبانی ایسی بدعادتیں اور خصلتیں تھیں۔

علاماتِ نفاق | عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے حضورِ اکرم
اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں یہ چار باتیں ہونگی

اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (بخاری)

وہ منافق خالص ہے (یعنی منافق عملی ہے) اور جس میں ان خصائل میں سے ایک ہوگی اس میں ایک خصلت نفاقِ عملی کی پائی جائے گی حتیٰ کہ اس کو ترک کردے۔ جب امانت رکھی جائے خیانت کرے۔ جب بات کرے جھوٹ بولے جب عہد کرے تو دغا دے اور جب جھگڑے تو گالی دے۔

نفاقِ حقیقی کی تعریف نفاق دو قسم پر ہے۔ نفاقِ اصلی و حقیقی جس کو نفاقِ اعتقادی بھی کہتے ہیں۔ وہ تو یہ ہے کہ زبان سے تو اسلام کا اظہار ہو اور دل میں کفر کو چھپایا جائے یعنی آدمی دل سے تو اسلام کو قبول نہ کرے بلکہ دل سے اس کا منکر اور مخالف ہو لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے کو مومن ظاہر کرتا ہو۔ جیسا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عبداللہ بن اُبی وغیرہ مشہور منافقین کا حال تھا کہ یہ لوگ بظاہر کلمہ پڑھتے تھے اور نماز و روزہ کی پابندی بھی کرتے تھے مگر دل سے اسلام کے منکر اور دین کے دشمن تھے۔ یہ نفاق تو ایمان و عقیدے کا نفاق ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے اور اسی کے بارہ میں قرآنِ حکیم نے اعلان کیا ہے۔

(۱) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ — منافق ہی فاسق ہیں یعنی دین سے خارج ہیں)

(۲) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ — تحقیق منافق جہنم کے بدترین گوشہ میں ڈالے جائیں گے۔

نفاقِ عملی دوسری قسم نفاقِ عملی ہے جس کا تعلق ایمان و عقیدہ سے نہیں بلکہ عمل و کردار سے ہوتا ہے یعنی منافقِ عملی وہ ہے جس کے ایمان و عقیدہ میں تو خرابی نہیں ہوتی مگر سیرت و کردار میں نفاق ہوتا ہے اور وہ منافقوں کی سی عادتیں اور خصلتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس نفاقِ اعتقادی کفر کی ذلیل ترین قسم ہے اور نفاقِ عملی معصیت اور گناہ کبیرہ ہے اور ایک مسلمان کے لئے جیسے یہ ضروری ہے کہ وہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی

نجاست سے بچے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ مُنافقانہ سیرت اور مُنافقانہ اعمال و اخلاق کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے۔

بعض مُنافقانہ اعمال و افعال کچھ بُری عادتیں اور خصلتیں ایسی ہیں جن کو مُنافقین کے ساتھ خاص نسبت اور مناسبت ہے۔ اسلام چونکہ سچائی، امانت، دیانت، ایفائے عہد اور حق پسندی ایسے اعمالِ حسنہ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے کتاب و سنّت میں منافقانہ اعمال و کردار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ مسلمان منافقانہ اعمال و اخلاق سے اپنے آپ کو بچائیں۔ مثلاً سورہ توبہ رکوع ۱۳ میں جن منافقانہ اعمال و کردار کا بیان ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :-

(۱) جہاد یعنی اقامتِ دین کی جدّوجہد کو فتنہ کہہ کر گریز کرنا (۲) اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کراہت کرنا۔ صراطِ مستقیم پر چلنے سے روکنا اور باطل کی راہوں پر چلنے کا مشورہ دینا (۳) نماز کی ادائیگی میں تساہل برتنا (۴) دین کے دشمنوں سے مل کر سازشیں کرنا (۵) عہد و پیمان کو توڑ دینا (۶) جُھوٹے وعدے کرنا (۷) جُھوٹی قسمیں کھانا (۸) دین کے دشمنوں سے دوستی اور ربط قائم رکھنا وغیرہ۔ ان سب کو نفاق آلود عادات و خصائل قرار دیا گیا۔ اسی طرح احادیث میں نفاقِ عملی سے بچنے کے لئے متعدد امور کی نشاندہی کی گئی۔

حدیث زیرِ تفہیم میں خصائلِ نفاق میں سے چار کا ذکر فرمایا۔ خیانت، جھوٹ، عہد شکنی اور بد زبانی۔ اور ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو اس کو سمجھنا چاہیئے کہ اس میں ایک منافقانہ خصلت ہے اور جس میں چاروں خصلتیں ہوں وہ اپنی سیرت میں خالص منافقِ عملی ہے۔

(۱) جھوٹ میں ہر بات داخل ہے جو حق جاننے کے بعد اس کے خلاف کہی جائے اور سنی ہوئی بات بغیر تحقیق کے اس طرح روایت کر دی جائے جیسے وہ تحقیق شُدہ ہے۔

(۲) دُوسری علامت نفاق "خیانت" ہے۔ اس سلسلہ میں ملحوظ رہنا چاہیئے کہ امانت میں ہر وہ چیز داخل ہے جو کسی مالک کی جانب سے کسی اور کے قبض و اختیار میں بغرضِ حفاظت دی جائے۔

اور وہ باوجود اس پر اختیار رکھنے کے مالک کے منشاء کے خلاف یا اس کی اجازت کے بغیر استعمال کا کوئی حق نہ رکھتا ہو۔ پس جس طرح انسان ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھتے ہیں اس طرح کچھ امانتیں اللہ نے بھی بندوں کے پاس رکھی ہیں اور یہ مال و دولت، یہ عقل و فہم یہ جسمانی قوّت و اختیار وغیرہ یہ سب اللہ ہی کی تو ملکیت ہیں جنہیں اس نے بندوں کے پاس امانت رکھا ہے اور وہ تمام صورتیں متعیّن کر دی ہیں جن میں ان امانتوں کا استعمال جائز یا ناجائز ہو سکتا ہے۔

بالخصوص مومنین سے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے جان و مال کو جنّت کے عوض خرید لیا ہے۔

اس رو سے اللہ ہی ان کی دولت و عقل و فہم کا مالک ہے پس جس طرح دنیاوی معاملات میں امانت رکھنے والا امانت رکھی ہوئی شے کو مالک کے منشاء کے خلاف استعمال کر کے خائن بن سکتا ہے اسی طرح ایک مومن اپنے مال، عقل و فہم، صلاحیت و اختیار کو مالک حقیقی کے منشاء کے خلاف استعمال کر کے خائنین کی فہرست میں داخل ہو سکتا ہے۔ غرضکہ خیانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مال میں خیانت ہو یا کسی کے راز کو افشا کر دیا جائے یا کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو کر ظلم کیا جائے۔ یہ سب خیانت کی صورتیں ہیں۔

تیسری علامت عہد شکنی ہے۔ اس کے متعلّق دو قول ہیں اوّل یہ کہ مکروہ تحریمہ ہے۔ دوم یہ کہ مکروہ تنزیہہ ہے۔ کما قالہ النووی لیکن حدیث ترمذی میں ہے کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اپنے مسلمان بھائی سے اس نیّت کے ساتھ وعدہ کیا کہ اس کو پورا کرے گا پھر پورا نہ کر سکا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں مسئلہ یہ ہوا وعدہ کرتے وقت عہد شکنی کا عزم ہو تو یہ ممنوع ہے لیکن صدق دل کے ساتھ وعدہ کیا جائے اور اس عزم کے ساتھ عہد کیا جائے کہ پورا کروں گا۔ پھر غفلت یا بھول یا کسی مانع کی وجہ سے پورا نہ کر سکا تو اُمید ہے کہ مُواخذہ نہ ہو گا۔

چوتھی بدزبانی ہے پھر بدزبانی بھی مومن کے ساتھ ہو تو اس کی قباحت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے

جہاں مسلمان بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا عبادت ہو۔ وہاں اس کے ساتھ بدزبانی سے پیش آکر اس کا دل دکھانا اس کی برائی کا کیا ٹھکانا ہے۔

راہِ خدا میں جہاد حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ   جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا
بِهٖ نَفْسَهٗ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ   اور نہ کبھی جہاد کی تجویزیں سوچیں اور تمنّا کی تو وہ
(رواہ مسلم)   نفاق کی ایک صفت پر مرا۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان کے دعویٰ کے باوجود نہ تو جہاد کیا اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کا شوق اور اس کی تمنّا پیدا ہوئی تو یہ منافق کی زندگی ہے اور جو اس حال میں مر گیا تو نفاق کی ایک صفت کے ساتھ دنیا سے گیا۔

نماز میں سُستی ایک اور حدیث میں فرمایا:۔

تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ   یہ تو منافق کی سی نماز ہے کہ بے پرواہی سے بیٹھا
يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰٓى اِذَا اصْفَرَّتْ   آفتاب کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ زرد ہو گیا
وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ   اور اس کے غروب کا وقت قریب ہو گیا تو نماز
قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ   کے لئے کھڑا ہو گیا اور چڑیا کی طرح چار چونچیں
فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا   مار کر نماز ختم کر دی اور اللہ کا ذکر بھی اس میں
(رواہ مسلم)   بہت کم کیا۔

اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ مومن کی شان تو یہ ہے کہ شُوق کی بے چینی سے نماز کے وقت کا مُنتظر رہے اور جب وقت آئے تو خوشی اور مستعدی سے نماز کیلئے کھڑا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت مجھے مالک الملک کے حضور حاضری نصیب ہے، پورے اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرے۔

قیام وقعود۔ رکوع وسجود میں خُوب خُوب اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس سے اپنے دل کو شاد کرے یہ تو ہے مومن کے نماز پڑھنے کی شان۔ لیکن منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز کو بوجھ سمجھتا ہے وقت آجانے پر بھی ٹالنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً عصر کی نماز کیلئے اس وقت اٹھتا ہے جب کہ سورج بالکل ڈُوبنے کے قریب ہوجاتا ہے اور پھر جلدی جلدی چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کر نماز پوری کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی بس برائے نام ہی کرتا ہے۔ پس یہ نماز مُنافق کی نماز ہے۔ جو کوئی مسلمان اس سُستی، کاہلی سے نماز ادا کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے مومنوں والی نہیں بلکہ منافقوں والی نماز پڑھی ہے۔

اذان کے بعد مسجد سے نکلنا ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہوجائے اور وہ اذان کے بعد بھی بلا کسی خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے۔

وَ هُوَ لَا يُرِيدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ (ابن ماجہ)

اور نماز میں شرکت کے لئے واپسی کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو تو وہ منافق ہے۔

مطلب یہ کہ اذان ہوجانے کے بعد مسجد سے نکل جانا اور شرکتِ نماز کیلئے واپسی کا ارادہ نہ رکھنا منافقانہ طرزِ عمل ہے اور ایسا کرنے والا گو مُنافقِ حقیقی تو نہیں مگر مُنافقِ عملی ضرور ہے۔ الغرض حدیث میں نفاقِ عمل کی کثیر مثالیں موجود ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ہر قسم کے نفاق سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

غوث الاعظم سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز نے فرمایا

اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو، بدعادات سے بچو، صبر کو شیوہ بناؤ۔ سختی کے بعد راحت کا آنا لازمی جان لو۔ تکلیف میں نا امید نہ ہوجایا کرو۔ توبہ سے گناہوں کو دھو ڈالا کرو۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

واضح ہو کہ ماموربہٖ یعنی وہ کام جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے دو قسم پر ہیں غیر موقت یعنی جن کا کرنا کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہ ہو جیسے زکوٰۃ، عشر، نذر مطلق وغیرہ۔ زکوٰۃ کا سبب مالک نصاب ہونا ہے اور اس کی شرط ایک سال کا گزرنا ہے۔ مگر اس کی ادائیگی کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ جب بھی ادا کی جائے گی ادا ہو جائے گی۔ دوسری قسم موقّت ہے کہ جس کا تعلّق ایک خاص وقت کے ساتھ ہے اس وقت میں اس کو کیا جائے تو ادا ہے اور اس وقتِ مخصوص کے سوا اگر کیا جائے تو ادا نہ ہو گی بلکہ قضا ہو گی۔ اس کی مثال نماز ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے وقت مقرر ہیں۔ وقت پر نہ پڑھی گئی تو قضا ہو جائیگی

(۲) نماز کے اوقات۔ تعدادِ رکعات، شرائط و آداب کی پوری تفصیل تو قرآن مجید میں نہیں ملتی۔ البتہ ان امور کا اجمالی ذکر ہے اور ان کے اصول قرآن نے بیان کئے ہیں مثلاً سورۂ بقرہ کی یہ آیت جس میں لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں ایک جامع آیت ہے۔

فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا   پھر جب تم امن میں ہو تو خدا کو یاد کرو جیسے اس نے
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ بقر ۳۲)   تمہیں تعلیم دی جس سے پہلے تم ناواقف تھے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ نماز اور اس کے شرائط و آداب اللہ عزّ و جل نے اسی طرح تعلیم فرمائے ہیں جس طرح قرآن مجید کے اس اجمال کی تفصیل و تشریح سنتِ نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریراً اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواترِ عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن مجید میں اس کے عملی حوالے اور متعلّقہ احکام بیان ہوئے۔

نماز کی پابندی اور اس کی نگہداشت | نماز کی مداومت کے لئے قرآن مجید میں ایک خاص لفظ محافظت کا استعمال ہوتا ہے جسکے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا۔ وقت پر ادا کرنا سب داخل ہیں

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ	نمازوں کی نگرانی رکھو۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ	وہ جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۱)	وہ جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

ان آیات میں سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ نماز ایک ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں اور اس کو ہمیشہ پابندیٔ وقت اور اس کے شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے ادائے نماز کیلئے اوقات کے مقرر ہونے کی تصریح بھی قرآن نے کی۔

قرآن میں نماز کے اوقات

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا ۱	بیشک نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ فرض نمازوں کیلئے اوقات مخصوص ہیں۔ ادائے نماز کے لئے قرآن مجید نے زیادہ تر تین الفاظ استعمال کئے ہیں صلوٰۃ و اقامت صلوٰۃ تسبیح۔ ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید و یاد الٰہی اور نماز کیلئے بولا جاتا ہے۔ احادیث میں تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں (مسلم باب صلوٰۃ) اور اشعارِ عرب اور لغتِ عرب سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے قرآن میں جب تسبیح کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے۔ البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر جہاں تسبیح کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس سے اللہ عزوجل کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک کی متعدد آیات میں پانچ وقت نماز پڑھنے کے اوقات کا بالتصریح اور بالاجمال ذکر ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ کی صرف ایک آیت سے اوقاتِ پنجگانہ کی تفصیل کا استدلال کیا جا سکتا ہے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر آفتاب نکلنے
وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے پہلے اور آفتاب کے ڈوبنے سے پہلے اور رات
فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰهٰ رکوع ۸) کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے۔ ڈوبنے سے پہلے عصر ہے۔ رات کے کچھ وقت سے مراد عشاء ہے اور دن کے کناروں میں ظہر و مغرب ہے۔ اسی طرح علیحدہ علیحدہ آیتوں سے بھی اوقاتِ پنجگانہ کا استدلال ہو سکتا ہے۔ مثلاً

(۱) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسراء ع ۹) زوالِ آفتاب کے وقت نماز قائم کر۔ یہ ظہر کی نماز ہے

(۲) وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (ق۔ ۳) اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر۔

(۳) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (دھر ۲) اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو یہ عصر کی نماز ہوئی۔ اسی کو وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ بیچ کی نماز سورہ بقر میں کہا گیا ہے کیونکہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

(۴) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ہود۔ ۱) "اور دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں نماز قائم کر"۔ دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے یہ فجر اور مغرب کی نماز ہوئی۔

(۵) سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے آواز دیئے زنانہ مکان میں مت جایا کرو مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نور۔ ۸) اس سے نماز فجر کا عملی ثبوت بھی ملتا ہے۔

(۶) پھر اسی میں یہ ہدایت بھی کہ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ "اور عشاء کی نماز کے بعد" کہ مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو آرام کرنے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے کسی مسلمان کے مکان میں بلا اجازت نہ جانا چاہیے یہ بھی نمازِ عشا کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقاتِ نماز ہیں۔

نماز کی شرطیں: واضح ہو کہ فرضیتِ نماز کا سبب حقیقی امر الٰہی ہے اور سبب ظاہری وقت ہے صحتِ نماز

کی چھ شرطیں ہیں کہ بے ان کے ہوگی ہی نہیں۔ طہارت، سترِ عورت، استقبالِ قبلہ، وقت، نیت، تکبیر تحریمہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا اللہ عزوجل نے فرمایا بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے
مَّوْقُوْتًا وقت باندھا ہوا۔

ہر نماز کیلئے وقت مقرر ہے اور اس کی محافظت فرض ہے

واضح ہو شرعِ مطہر نے ہر نماز کیلئے جدا وقت مقرر فرمایا ہے کہ نہ وقت سے پہلے صحیح نہ وقت کے بعد تاخیر جائز۔ بلکہ فرض ہے کہ ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کیا جائے۔ زیرِ عنوان آیت کی تفسیر میں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ العزیز نے تحریر فرمایا۔ یُقْتَضِی الکون لِکُلِّ صَلَاۃٍ وَقْتًا عَلٰیحِدَۃً یعنی مقتضا آیت یہی ہے کہ ایک نماز کے وقت میں دوسری نماز ادا نہیں ہو سکتی اور یہ حکم عام ہے مسافر و مقیم صحیح و مریض غرضیکہ ہر مسلمان کے لئے یہ ہی حکم ہے کہ وہ نماز کو اس کے وقت مقررہ میں ادا کرے۔ اللہ عزوجل نے محافظت و التزام اوقات کا حکم سات سورتوں میں نازل فرمایا۔ بقرہ، لنساء، مریم، مومنون، معارج، ماعون، اس سلسلہ کی چند احادیث یہ ہیں:۔

نوعِ اول ۔ وہ احادیث جن میں محافظتِ وقت ادا اس کی ترغیب اور اس کے ترک سے ترہیب ہے۔

حضرتِ حنظلہ کہتے ہیں کہ رسول کریم علیہ السلام نے فرمایا جس نے ان پانچوں نمازوں کی ان کے رکوع و سجود اور

(۱) وَمَوَاقِیْتِہِنَّ وَعَلِمَ اَنَّہُنَّ حَقٌّ مِّنْ اوقات کی محافظت کی اور یقین جانا کہ وہ اللہ عزوجل کی
عِنْدِ اللہِ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (امام احمد) طرف سے ہیں جنت میں جائے گا۔

(۲) اس مضمون کی حدیث کو مالک، ابوداؤد، نسائی و ابن حبان نے حضرت عبادہ بن صامت سے (۳) ابوداؤد نے حضرت قتادہ سے (۴) ابوداؤد و طبرانی نے حضرت ابودرداء سے (۵) دارمی نے حضرت کعب بن عجرہ سے (۶) طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے (۷) طبرانی نے انس بن مالک سے (۸) ابوداؤد نے حضرت فضالہ زہرانی سے (۹) بخاری و مسلم، ترمذی و نسائی و دارمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے (۱۰) بیہقی نے بطریق

عکرمہ جناب فاروقِ اعظمؓ سے (۱۱) امام مالک نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہم ۔

نوعِ دوم : حدیث امامتِ جبریل جس میں انہوں نے ہر نماز کے لئے جدا وقت معین کیا جن کا مضمون یہ ہے کہ جبرئیل امین نے بعد تعینِ اوقات عرض کی ۔

بِہٰذَا اُمِرْتَ اَوْقَالَ ھٰکَذَا اُمِرْتُ" اس کا حضور کو حکم دیا گیا ہے ایسا ہی حضور کو حکم دیا گیا
"مَابَیْنَ ھٰذَیْنِ وَقْتُ صَلٰوۃٍ ہے ان دونوں کے درمیان وقتِ نماز ہے ۔

(۱) اس مضمون کی حدیثیں بخاری و مسلم مالک و موطا و دارمی نے حضرت ابو مسعود انصاری سے (۲) طحاوی ابوداؤد ترمذی ابن حبان حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے (۳) نسائی و احمد و اسحٰق و ابن حبان و حاکم نے جابر ابن عبداللہ سے (۴) طحاوی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیں ۔

نوعِ سوم : وہ احادیث جن میں یہ ہے کہ سائل کے پوچھنے پر حضور نے امامتیں کرا کر ہر نماز کا اول آخر وقت بتایا اور پھر فرمایا ،

وَقْتُ صَلٰوتِکُمْ مَابَیْنَ مَارَأَیْتُمْ ۔ نماز کا وقت اس کے درمیان ہے جو تم نے دیکھا ۔

(۱) اس مضمون کی احادیث مسلم ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی نے حضرت بریدہ سے (۲) مسلم طحاوی، ابوداؤد و نسائی و ابن حبان نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے (۳) مالک و نسائی و بزار نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کیں ۔

نوعِ چہارم : وہ احادیث جن میں حضور نے پیش گوئی فرمائی کہ کچھ لوگ وقت گذار کر نماز پڑھا کریں گے تم ان کا اتباع نہ کرنا اور یہ بات مطلقاً ارشاد فرمائی ۔ سفر و حضر کی تخصیص نہیں کی ۔

(۱) مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد ۔ احمد دارمی، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور علیہ السلام نے میری ران پر ہاتھ مار کر فرمایا ۔ تیرا کیا حال ہوگا جب تو ایسے لوگوں میں رہ جائے گا جو نماز کو اس کے وقت سے تاخیر کریں گے ۔ میں نے عرض کی حضور مجھے کیا حکم ہے ؟

قَالَ صَلِّ الصَّلٰوۃَ لِوَقْتِہَا — تو نماز کو اس کے وقت پر ہی پڑھنا۔

(۲) اس مضمون کی حدیث کو امام احمد و ابن ماجہ نے بسندِ صحیح حضرت عبادہ بن صامت سے۔

(۳) ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا۔

نوع پنجم: وہ احادیث جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف وصریح طور پر ارشاد فرمایا کہ جب ایک نماز کا وقت آیا دوسری کا جاتا رہا قضا ہوگئی اور اس کی مخالفت و مذمت فرمائی۔

(۱) مسلم، ابوداؤد ونسائی وعیسیٰ بن ابان حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے راوی حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

وَقْتُ الظُّہْرِ مَالَمْ یَحْضُرِ الْعَصْرُ وَ — ظہر کا وقت جب تک ہے کہ عصر کا وقت نہ آئے اور

وَقْتُ الْمَغْرِبِ مَالَمْ یَسْقُطْ نُوْرُ الشَّفَقِ — مغرب کا وقت جب تک ہے کہ شفق نہ ڈوبے۔

(۲) مسلم وابوداؤد، ابن ماجہ طحاوی وابن حبان حضرت ابوقتادہ سے راوی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوتے ہیں کچھ تقصیر نہیں تقصیر تو جاگتے ہیں ہے۔

اَنْ تُؤَخِّرَ صَلٰوۃً حَتّٰی یَدْخُلَ وَقْتُ — کہ تو ایک نماز کو اتنا پیچھے ہٹائے کہ دوسری نماز کا

صَلٰوۃٍ اُخْرٰی — وقت آجائے

(۳) امام طحاوی حضرت عبداللہ بن عباس سے راوی

قَالَ لَا تَفُوْتُ صَلٰوۃٌ حَتّٰی یَجِیْئَ وَقْتُ الْاُخْرٰی — نماز فوت نہیں ہوتی جب تک دوسری نماز کا وقت نہ آجائے

یعنی جب دوسری نماز کا وقت آیا پہلی قضا ہوگئی

(۴) امام بزار ومحی السنہ بغوی حضرت سعد بن ابی وقاص سے راوی کہ میں نے حضور علیہ السلام سے پوچھا وہ کون لوگ ہیں جنہیں اللہ عزوجل قرآن مجید میں فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔

قَالَ ھُمُ الَّذِیْنَ یُؤَخِّرُوْنَ الصَّلٰوۃَ عَنْ وَقْتِہَا — حضور نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اسکے وقت سے ہٹا کر پڑھیں۔

(۵) ابو قتادہ عدوی جو اجلۂ اکابر و ثقاتِ تابعین سے ہیں بلکہ بعض نے انہیں صحابہ میں گنا فرماتے ہیں کہ مَیں نے امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا فرمان سنا۔

ثَلٰثٌ مِّنَ الْکَبَائِرِ الْجَمْعُ بَیْنَ الصَّلَاتَیْنِ کہ تین باتیں کبیرہ گناہوں میں سے ہیں، دو نمازیں جمع
وَالْفِرَارُ مِنَ الزَّحْفِ وَالنُّھْبَۃُ کرنا جہاد میں کفار کے مقابلہ سے بھاگنا اور کسی کا مال لوٹنا

واضح ہو کہ یہ حدیث موطا کی ہے جو اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے اس کے سب رجال اسمٰعیل بن ابراہیم ابن علیہ سے آخر تک ائمہ ثقات عدول رجالِ صحیح مسلم سے ہیں۔

ان تمام آیات و احادیث سے آفتابِ نیمروز کی طرح واضح ہُوا کہ ہر نماز کیلئے خاص وقت جداگانہ مقرر ہے کہ نہ اس سے پہلے پڑھنا جائز اور نہ اس کے بعد تاخیر کی اجازت ہے (۲) ہر نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا فرض ہے۔ (۳) سوا ظہر بن عرفہ و عشا بینِ مزدلفہ کے دو نمازوں کو قصداً ایک وقت میں جمع کرنا سفراً حضراً کسی طرح جائز نہیں (۴) نماز کیلئے تعین اوقات قرآن عظیم کی آیات اور حضور سید العلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے قطعی الثبوت ہے اور اس کے خلاف کے لئے دلیل ویسی ہی قطعی چاہیئے۔ جیسے عصرِ عرفہ و مغرب مزدلفہ کا اجماعی مسئلہ ورنہ یقینی کے مقابل ظنی مضمحل۔

صلوٰۃ کے معنیٰ لغت میں صلوٰۃ کے معنیٰ دعا کے ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اور حدیث میں ہے وَاِنْ کَانَ صَائِمًا فَلْیُصَلِّ اس آیت اور حدیث میں صلوٰۃ بمعنے دعا ہے۔ امام نووی نے فرمایا صلوٰۃ کا اشتقاق صلوین سے ہے اور صلوین سُرین کی دو ہڈیوں کو کہتے ہیں۔ علامہ قسطلانی نے فرمایا صلوٰۃ "صلیٰ" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ بانس کو انگاروں پر رکھ کر سیدھا کرنے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے صلوٰۃ کے اصل معنیٰ رحمت کے ہیں لہٰذا صلوٰۃ کو صلوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ رحمت ہے یا اس لئے کہ اس میں نمازی رکوع و سجود میں اپنے سُرین ہلاتا ہے یا اس لئے کہ صلوٰۃ سے آدمی راہِ راست پر آجاتا ہے تو جس کی کجی نماز سے جاتی رہے قیامت کے دن اسے آگ سے سیدھا کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ علماء نے فرمایا صلوٰۃ کو صلوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ

مُصلّی امام کا تابع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ:۔

امام کی نماز فاسد ہو تو مقتدی کی بھی نماز فاسد ہوجاتی ہے (ولاعکس)

سہوِ امام سے مقتدی پر بھی سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔

مقتدی کو امام سے پہلے رکوع و سجود ممنوع ہے۔

امام کا سُترہ مقتدیوں کے حق میں بھی کافی ہے۔

اس کے علاوہ ہر وہ عبادت جو تعظیم و خشیتِ خالق کے لئے ہو اس کو صلوٰۃ کہہ سکتے ہیں اور اس معنے میں صلوٰۃ افرادِ انسانی کے ساتھ خاص نہیں رہتی بلکہ تمام مخلوقات کے لئے مشترک ہوجاتی ہے تو ہر چیز کی صلوٰۃ اسکے مناسبِ حال ہوگی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا کل قد علم صلاتہ و تسبیحہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ تمام مخلوقات وظیفۂ صلوٰۃ میں مشترک ہیں۔ البتہ اس کی نوعیت و صورت میں فرق ضرور ہے جیسے سجدہ ہی کو لیجئے۔ تمام مخلوقات اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہے وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لیکن سجدہ کی صورت میں فرق ہے انسان کے سجدہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے سات اعضا پر سجدہ کرتا ہے اور دوسری اشیاء کی سجدہ کی صورت اور ہے۔

نماز کی اہمّیت حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ یٰآ یُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ یہ ہی نماز کی بنیاد ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔

قرآن پاک کی تصریح کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں تو اس کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت شعیب، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت لقمان

حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت زکریا۔ ان سب جلیل القدر انبیاءِ کرام علیہم السلام کے متعلق قرآن پاک نے بتایا یہ سب کے سب نماز پڑھتے تھے۔ اپنے اہل وعیال اور اپنی قوم کو نماز کا حکم دیتے تھے۔ دیکھو سورۂ مریم ہود، انبیاء، لقمان، ابراہیم، یونس، مائدہ، آلِ عمران۔

قرآن وحدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی بعض یہودی اور عیسائی نماز پڑھتے تھے (آلِ عمران ۱۲) حضور علیہ السلام نے فرمایا یہودیوں کی طرح ننگے نماز نہ پڑھو (کنز العمال ج ۴ ص۲۷ تا ص۱۱۴)

نماز اسلام کا سب سے اہم واکرم فریضہ ہے۔ عبادات میں سب سے اشرف وافضل نماز ہی ہے۔ قرآن پاک میں تقریباً سو مرتبہ سے زیادہ نماز کا ذکر اور اس کی بجاآوری کی تاکید آئی ہے اور اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قُدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (روم) اور نماز کو قائم رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

آیتِ بالا سے ایک تو توحید وایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوئی اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ترکِ نماز سے کفر وشرک میں گرفتار ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جب دل کی کیفیت کو بیرونی اعمال کے ذریعہ نہ بڑھاتے رہا جائے تو خود اس کی کیفیت کے (ایمان) زائل ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ہمیشہ خاص طور سے نماز پر زور دیا اور اس کے تارک کے متعلق شرک وکفر کا ڈر ظاہر فرمایا۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود اوّلیں پرسشِ نماز بود

تارکِ صلوٰۃ کافر ہے؛ حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں جانتے سوا نماز کے۔ بہت سی ایسی حدیثیں آئیں جن کا ظاہر یہ ہے کہ قصداً نماز کا ترک کفر ہے اور بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت فاروقِ اعظم، عبدالرحمٰن بن عوف، وعبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، معاذ بن جبل، ابوہریرہ، ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مذہب تھا۔ بعض ائمہ کرام

مثلاً حضرت امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک و امام نخعی کا بھی یہ ہی مسلک ہے۔ البتہ ہمارے امام ابوحنیفہ و دیگر ائمہ کرام نیز کثیر صحابہ کرام تارکِ صلوٰۃ کی تکفیر نہیں کرتے۔ مگر کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ان جلیل القدر حضرات کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کافر ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث کیلئے اہلِ علم حضرات نیل الاوطار نووی عینی کا مطالعہ کریں (۲) ہر مکلف یعنی عاقل و بالغ پر نماز فرضِ عین ہے اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے اور جو قصداً چھوڑے اگرچہ ایک ہی وقت کی وہ فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو قید کیا جائے حتّٰی کہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے بلکہ آئمہ ثلاثہ مالک، شافعی، احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک سلطانِ اسلام کو اس کے قتل کا حکم ہے (درمختار) (۳) نماز خالص عبادت بدنی ہے اس میں نیابت جاری نہیں ہو سکتی یعنی ایک کی طرف سے دوسرا نہیں پڑھ سکتا (۴) فرضیتِ نماز کا سببِ اصلی امرِ الٰہی ہے اور ظاہری سبب وقت ہے کہ اول وقت سے آخر تک جب بھی پڑھے ادا ہو جائیگی اور فرض ذمہ سے ساقط ہو جائے گا (۵) بچہ کی جب سات برس کی عمر ہو جائے تو اس کو نماز پڑھنا سکھایا جائے اور جب دس برس کا ہو جائے (اور نہ پڑھے) تو سختی سے پڑھوانی چاہیئے۔

عبادت میں میانہ روی اختیار کی جائے

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور مسجد میں آئے تو دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان ایک رسّی لٹکی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کیسی رسّی ہے۔ صحابہ نے جواباً کہا حضرت زینب کی رسّی ہے (وہ تہجد پڑھتی ہیں) جب انہیں نیند آنے لگتی ہے تو اس سے لٹک جاتی ہیں۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا حُلُّوْہُ لِیُصَلِّ اَحَدُکُمْ نَشَاطَہٗ فَاِذَا فَتَرَ فَلْیَقْعُدْ

نبی علیہ السلام نے فرمایا نہیں اس کو کھول دو تم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ اپنی طبیعت کی خوشی تک نماز پڑھے اور جب تھک جائے بیٹھ جائے

(۱) مطلبِ حدیث یہ ہے کہ آدمی اسی قدر نفل عبادت کرے جتنی کہ ذوق و شوق کے ساتھ کر سکے کیونکہ

ایسی عبادت و ریاضت جس سے آدمی اکتا جائے وہ ہمیشہ نبھ نہیں سکتی اور بہترین عمل وہی ہے جو ہمیشہ کیا جا سکے (۲)، یہ خاتون خولہ بنت زینب تھیں جو ساری رات تہجد پڑھتی تھیں اور جب نیند آتی تو رسّی سے ٹک جاتیں۔ حضور علیہ السلام نے ان کے اس فعل پر انکار فرمایا اور یہ تعلیم دی کہ عبادت میں ایسی سختی اچھی نہیں ہے کہ وہ آدمی کے لئے بوجھ بن جائے ۔

کیا کثرتِ عبادت ممنوع ہے؟ وہ تمام حدیثیں جن میں کثرتِ عبادت کی ممانعت آئی ہے یہ نہی صرف ایسے افراد کے لئے ہے جو عبادت و ریاضت میں ایسے مشغول و مصروف ہو جائیں کہ حقوق العباد تک تلف ہو جائیں اور عبادت ان کے لئے بار ہو جائے لیکن وہ لوگ جنہیں کثرتِ عبادت میں دِقّت نہ ہو بلکہ عبادت ان کی غذا بن جائے تو ان کے لئے کثرتِ عبادت ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود و مطلوب ہے ۔ قرآن مجید میں فرمایا :۔ کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ۔

(۲)، نیز حضور علیہ السلام کی عبادت ایسی ہوتی تھی کہ آپ کے قدم متورم ہو جاتے تھے (بخاری) رمضان کے آخری عشرہ میں حضور ساری رات عبادت میں گذار دیتے تھے (مسلم) حضرت عثمان غنی و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ساری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے (ابن کثیر) اس باب میں حضور علیہ السلام کی اصولی ہدایت یہ ہے ۔

عَلَیْکُمْ مَا تُطِیْقُوْنَ مِنَ الْاَعْمَال (بخاری) تم اتنے عمل کو لازم پکڑو جس کی طاقت رکھتے ہو ۔

ظاہر ہے کہ طبائع قوت و ضعف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں ۔ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو ایک شے کی طاقت رکھتے ہیں اور دوسرے اس کی طاقت نہیں رکھتے ، معلوم ہوا کہ ایسی کثرتِ عبادت کی ممانعت ہے جو انسان کی برداشت سے باہر ہو ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

لِیُصَلِّ اَحَدُکُمْ نَشَاطَهٗ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اتنی نفلیں پڑھے جتنی کہ خوشدلی کے ساتھ پڑھ سکے ۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ساری رات قیام کر سکے اور ساری رات کی عبادت گذاری اس کو دشوار نہ ہو تو اس کی ممانعت نہیں ہے ۔

رزقِ حلال

روزی کے متعلق سب سے پہلے اسلام نے اپنے پیرؤوں کو خوب اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء کا مالک ایک اللہ ہے۔ یہ مال و دولت حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں صرف خدا کا ہے

رزق کی کشائش اور تنگی دونوں کام خدا کے ہیں اور حکمت سے ہیں۔ دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھ ہی میں کوئی ایسی بات ہے یا مجھے ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی چلی آ رہی ہے لیکن مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کو مٹانے کے لئے کافی ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ہود - ۱)	زمین میں کوئی چلنے والا نہیں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔
لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (شوریٰ)	اسی کے ہاتھ میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔ وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق پھیلا دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے ناپ دیتا ہے۔ وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔
لِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	زمین اور آسمان کے خزانے اسی کے ہیں۔ خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور زمین میں ہے۔
لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی ملکیت یا بادشاہی اسی ایک اللہ کی ہے

قرآن مجید نے ان یقینیات کو بار بار بیان کر کے مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں اسی لئے رچایا ہے تاکہ ان

ہیں فیاضی۔ مال سے ایثار، شکر، قناعت پسندی اور بے طمعی کے جوہر پیدا ہوجائیں۔

حصولِ رزق کی کوشش کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے

روزی کمانا دراصل انسانی زندگی کی ضروریات سے ہے اور شرعاً و عقلاً ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل اور اصلاح کے لئے حصولِ رزق کی کوشش کرے۔ خواہ وہ تجارت و زراعت کی شکل میں ہو یا ملازمت و نوکری کی صورت میں۔ کتاب مجید میں فرمایا:۔

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا زمین کی تمام چیزیں اللہ نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں۔

رزقِ حلال خدا کا فضل ہے

اور سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ ۱) اپنے رب کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے رہو۔

فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (جمعہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

قرآن پاک کے محاورہ میں "خدا کا فضل تلاش کرنے" سے مقصود تجارت اور روزی کا کمانا ہوتا ہے معلوم ہوا کہ حصولِ رزق کی تلاش کرنا رزّاقِ کائنات کا فضل ہے اور یہ زمین اس کے لئے بمنزلہ میدان کے ہے اور اس میدان کی تمام اشیا انسان کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ایسے قواعد وضوابط مقرر کردیئے جائیں جن کے ماتحت فضلِ الٰہی کی تلاش کی جائے کیونکہ رزق اور اس کے حصول کے لئے اگر کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہ ہو اور اسے بے قید چھوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس طرح عدل اور ظلم، امانت اور خیانت، پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز کی تمیز اٹھ جائے گی اور یہ بات نظامِ انسانی کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگی۔

چنانچہ اسلام سے قبل دنیا کی کچھ ایسی ہی حالت تھی جس کے جی میں جو آتا اور جیسے آتا کماتا تھا حتیٰ کہ ظلم و جور سے کمائی ہوئی دولت پر فخر کیا جاتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے حصولِ رزق کے حدود مقرر کئے۔ جائز و ناجائز کی تفریق پیدا کی، حلال و حرام کا ضابطہ مقرر کیا۔ پاک روزی ڈھونڈنے اور اسی سے ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ ع ٢١)

اس آیت میں "اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ" کے جملہ سے رزقِ حلال کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے گویا یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کا اپنے رب کے ساتھ بندگی اور نیازمندی کا تعلق ہے اور اس تعلق کا اہم تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندے رزقِ حلال کی کوشش کریں اور ذرائع آمدنی کی صحت و پاکی کا خیال رکھیں کیونکہ رزق کے سلسلہ میں پاکی و صحت سے صرفِ نظر کر لینا اصولِ بندگی کے بھی خلاف ہے۔

رزقِ حلال کی اہمیت کا ایک اہم پہلو

آج کل کے بہت سے اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی معاملات یعنی خرید و فروخت۔ امانت۔ قرض۔ نوکری۔ مزدوری کی اصلاح کا اتنا اہتمام نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت لوگ جن کی حالت نماز روزہ وغیرہ عبادات کے لحاظ سے کچھ غنیمت بھی ہے۔ کاروباران کے بھی پاک نہیں ہیں۔ حالانکہ کاروبار کی پاکی اور معاملات کی صحت کے شعبہ کی اہمیت کا یہ عالم ہے اس کا تعلق بیک وقت اللہ تعالیٰ کے حق سے بھی ہے اور بندوں کے حقوق سے بھی۔ نماز روزہ وغیرہ عبادات اگرچہ ارکانِ دین ہیں اور اس حیثیت سے ایمان کے بعد انہیں کا درجہ ہے تاہم اگر کوئی شخص ان میں کوتاہی کرتا ہے تو صرف خدا کا مجرم ہوتا ہے۔ پھر اگر سچے دل سے توبہ و استغفار کی جائے تو بارگاہ خداوندی سے اس جرم کی معافی ہی کی امید ہے لیکن اگر لین دین میں خیانت واقع ہو جائے اور حصول رزق کے لئے ناجائز ذرائع کو اختیار کیا جائے تو اس طرح اللہ عزّ وجل کی نافرمانی بھی ہو گی اور کسی نہ کسی بندے کی حق تلفی بھی اور یہ بات ڈبل جرم قرار پائے گی۔

رہا یہ خیال کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے کرم سے معافی کی امید ہی ہے قیامت کے دن جس بندہ کی حق تلفی ہوئی ہے اس سے بھی معافی حاصل کر لی جائے گی۔ تو اگرچہ اس کا امکان ضرور ہے مگر کون کہہ سکتا ہے جو بندے ہم جیسے کم حوصلہ ہیں وہ قیامت کے دن ضرور ہی معاف کر دیں گے۔ پھر اگر وہ معاف نہ کریں تو؟

عرصاتِ محشر میں حقدار مدّعی بن کر انصاف کے طالب ہونگے

حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب وہ لوگ عرصاتِ محشر میں مقامِ حساب پر پہنچیں گے جن کی دنیا میں حق تلفی کی گئی ہے جن کے حقوق مارے گئے ہیں تو وہ مدّعی بن کر اللہ تعالیٰ سے انصاف کے طالب ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ انصاف اور فیصلہ فرمائے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز روزہ صدقہ وخیرات کی قسم کی ان لوگوں کی ساری نیکیاں ان مدّعیوں کو دلوادی جائیں گی اور جب ان نیکیوں سے بھی ان لوگوں کے حقوق پورے نہ ہوں گے تو ان مدّعیوں کے کچھ گناہ ان لوگوں پر لاد دیئے جائیں گے اور بالآخر یہ لوگ جہنّم میں ڈلوا دیئے جائیں گے۔

غالبًا اسی حیثیت سے ایک حدیث میں معاملات کی اصلاح کو صراحتہً نماز روزہ اور صدقہ وخیرات سے افضل بتایا گیا ہے۔ یہ حدیث ترمذی وابو داؤد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا:

اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَةِ ؟
میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جو روزہ اور صدقہ سے بھی افضل ہے۔

حاضرین نے عرض کی یارسول اللہ ضرور بتلایئے۔ آپ نے فرمایا:

اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ هِیَ الْحَالِقَةُ (ترمذی)
وہ چیز آپس کے معاملات کی اصلاح اور ان معاملات کی خرابی مونڈ دینے والا اُسترا ہے۔

بال مونڈنے والا اُسترا نہیں بلکہ ثوابِ آخرت کا صفایا کر دینے والا اُسترا۔

رزقِ حلال کی اہمیت کا ایک اور پہلو

معاملات کو دین کے دوسرے شعبوں کے مقابل یہ خاص امتیاز بھی حاصل ہے، اس میں اپنی ذاتی منفعت ومصلحت اور اپنی خواہشِ نفس کی اور اللہ عزوجل کے احکام کی کشمکش بہ نسبت دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ رہتی ہے نفس کی خواہش عموماً یہ ہی ہوتی ہے کہ جھوٹ سچ اور جائز ناجائز کا لحاظ کئے بغیر جیسا موقع ہو اور جس طرح بھی نفع کی زیادہ اُمید ہو کر گذرا جائے۔

اشیاءِ خوردنی میں ملاوٹ ۔ دھوکہ ۔ فریب ۔ حتیٰ کہ بچوں کے استعمال کی معمولی دوائی گرائپ واٹر تک کی بوتلوں پر جعلی لیبل لگا کر فروخت کرنا یہ سب خواہش نفس ہی کے محرکات ہیں ۔ اور اللہ کا دین یہ کہتا ہے کہ نفع کم ہو یا زیادہ ۔ تجارت میں فائدہ ہو یا نقصان، جھوٹ، فریب اور دھوکہ کے ذریعہ حصولِ رزق حرام و ممنوع ہے ۔ لہٰذا بندہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا سب سے زیادہ سخت امتحان معاملات و معاشرت کے احکام ہی میں ہوتا ہے ۔ قرآن مجید نے فرمایا :۔

مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ   اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچائے گئے وہی لوگ
الْمُفْلِحُوْنَ   (حشر ۱۱)   فلاح پانے والے ہیں۔

سورہ شمس میں فرمایا :۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ   مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا
دَسّٰهَا   (شمس ۱)   وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا ۔

مطلب یہ کہ یہ حرص و طمع کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو برائی اختیار کرنے حتیٰ کہ ایک کو دوسرے کی جان لے لینے تک ابھارتا ہے ۔

ان آیات کی توضیح میں حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

"حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا ۔ اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا ۔" (مسلم)

نسائی کی حدیث میں فرمایا ۔

"ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے" (نسائی)

سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے ۔

ایک اور حدیث میں فرمایا :۔

"انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص ۔" (ترمذی)

کئی صحابہ کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا :۔

"بھیڑیئے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی کہ مال و جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے ۔" (ترمذی)

غرضیکہ دینی و اُخروی فلاح و فوز انہیں کا حصّہ ہے جو اپنی خواہشِ نفس پر قابو رکھتے ہیں اور نفس کی بڑی سے بڑی تحریک انہیں جادۂ حق سے مُنحرف نہیں کرتی ہے ۔ لہٰذا جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر حصولِ رزق کے جائز طریقے اختیار نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا ۔ خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی ۔

حصولِ رزق کا ایک اور مرکزی اصول

اسلام نے حصولِ رزق سے متعلق عدل و انصاف پر مبنی جو اصول مقرر کیا ہے وہ ایک مرکزی حیثیت کا ہے کہ جس کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حصولِ رزق کے ذرائع میں سے کونسا ذریعہ حلال اور جائز ہے اور کونسا حرام اور ناجائز ہے ۔ سورہ نساء میں فرمایا ۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ اے ایمان والو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق
بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ ۔ (۵) سے مت کھاؤ لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے ۔

یہ آیت لین دین کے متعلق ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے لین دین کے ان طریقوں کو جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی کوئی حد نہیں ہے ایک لفظ "باطل" سے بیان کر دیا یعنی کسی کی چیز خواہ دھوکہ و فریب، ظلم و جور سے لی جائے یا چوری اور غصب، رشوت اور خیانت اور سود کے ذریعہ حاصل کی جائے غرضیکہ جس ناجائز طریقہ سے بھی دوسرے کا مال لیا جائے اس آیت کے عموم و اطلاق کے اندر داخل ہے ۔

پھر اس سلسلہ میں اسلام کی تکمیلی تعلیم کا یہ عالم ہے کہ اس نے ان نازک ناجائز معاملوں اور وسیلوں کی بھی جنہیں عام طور پر باطل نہیں سمجھا جاتا یا انہیں بہت ہی کم درجہ کا جرم خیال کیا جاتا ہے . . . . نشان دہی کی ہے اور ان کی دینی و دُنیوی برائیوں کی تشہیر کر کے ان کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے اور اپنے پیروؤں کو ان سے بچنے کی تاکید کی ہے ۔

معاملہ کا راستباز ہی آخرت کی کامیابی کا مستحق ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کیلئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں ان میں اسلام و ایمان اور خدا کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور ہر قسم کے معاملات میں راست بازوں ہی کا ہے ۔ سورہ احزاب میں فرمایا ہے :

وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا — اور سچے مرد اور سچی عورتیں خدا نے ان کیلئے مغفرت اور بڑا اجر رکھا ہے ۔ (احزاب ۵)

آخرت میں بھی یہ سچائی ہی کام آئے گی اور وہاں کی کامیابی کا ذریعہ بنے گی ۔ قیامت کی نسبت فرمایا :-

ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (مائدہ ۱۶) — یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا ۔

اسی سچائی کے مطابق آخرت میں اللہ عزوجل ثواب عطا فرمائے گا :-

لِیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِھِمْ ۔ (احزاب) — تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض عطا فرمائے

پھر یہ ہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا بلکہ اس کی اہمیت اسلام میں اتنی بڑھا دی گئی کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دینے ، سچوں ہی سے رابطہ و علاقہ رکھنے اور انہیں کی صحبت و معیت میں رہنے کی تاکید کی گئی ہے

اِتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (توبہ ۱۵) — اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو ۔

سچائی کا مفہوم عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر اسلام کی نظر میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لحاظ سے اسکے اندر اکیلے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی سچائی آجاتی ہے یعنی زبان کی سچائی ۔ دل کی سچائی ۔ عمل کی سچائی اور معاملات کی درستی و صحت کیلئے ان تینوں کا ہونا ضروری ہے ۔

دل کی سچائی ہوگی تو خواہشات نفس پر قابو حاصل ہوگا۔ زبان کی سچائی ہوگی تو منہ سے ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہیں نکلے گا اور عمل کی سچائی رشوت اور ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ بدعملیوں سے بچاتی ہے پس اسلام کے نزدیک حلال رزق وہی ہے جس کی بنیاد صداقت اور دیانت پر ہو۔

رزقِ حلال کی بنیاد صداقت و امانت پر ہے یوں بھی صداقت و دیانت کو معاملات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو۔ سورہ نساء میں فرمایا:۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا

بیشک اللہ عزوجل تم کو حکم دیتا ہے امانتوں کو انکے مالکوں کے حوالے کر دیا کرو۔ (نساء رکوع ۸)

اگرچہ اس آیت کا شانِ نزول خاص ہے لیکن معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جُز پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ اسی لئے صاحبِ تفسیرِ کشاف و ابنِ جریر نے تصریح کی کہ اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جسے عدل و انصاف سے موسوم کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ کسی کا بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں اور وہاں آپ دوسروں کے متعلق کچھ باتیں سن لیں تو اُن کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ و ہنگامہ اور ملک کے وقار کو نقصان پہنچانے کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کا ملازم ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے انجام دینا یہ بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کا ۷ گھنٹے کا ملازم ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا یا دیر سے آتا یا وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ یونہی ناپ تول میں کمی بیشی کرنا، خرید و فروخت کے وقت مبیع کے عیب کو چھپانا، جھوٹ اور فریب سے کام لینا یہ بھی امانت و دیانت کے خلاف ہی ہے۔

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ بدترین قسم کا گناہ ہے:۔ اور اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کرنا تو ایک بدترین قسم

کی خیانت اور بے ایمانی ہے کیونکہ اس سے صرف ایک شخص کی حق تلفی نہیں ہوتی بلکہ پورے معاشرہ کی حق تلفی ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے جو کاروبار میں ایمانداری اور دیانتداری کے اصول کی پابندی نہ کریں۔ ایک دن آپ غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ اس ڈھیر کے اندر داخل کر دیا تو اندر کچھ نمی وتری محسوس ہوئی آپؐ نے دُوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا قصّہ ہے اوپر سے تمہارا غلّہ خشک ہے اور اندر گیلا ہے۔ اس نے عرض کی کچھ بوندیں پڑ گئی تھیں جس سے غلّہ تر ہو گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ پھر تم نے اس بھیگے ہوئے غلّہ کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں ڈالا کہ خریدار تمہارے غلّہ کے گیلے پن کو دیکھ سکتا۔ اس کے بعد فرمایا:۔

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّيْ (مسلم) جو کوئی (کاروبار میں ایسا) دھوکہ کرے وہ میرا نہیں۔

وہ مال اور دولت جو ناجائز طریقہ سے حاصل کی جائے گا وہ برکت سے خالی ہو گی۔ دنیا میں تو یوں کہ ایسی دولت معاشرہ میں توازن کو ختم کر دیگی اور آخرت میں یوں کہ:۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِہٖ۔

وہ جسم جس کی نشو ونما حرام روزی سے ہو گی وہ جنت میں نہیں جائے گا اور جو جسم حرام سے پلا ہو اس کے لئے آگ ہی بہتر ہے۔

غور کیجئے کہ اسلام میں رزقِ حلال کی کیسی اہمیت ہے اور معاملات میں اسلام ہم سے کس قدر احتیاط کا طالب ہے۔

رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر حضورؐ نے لعنت فرمائی

اسی طرح کسی معاملہ میں رشوت دینا اور لینا بھی امانت و دیانت کے خلاف ہے۔ رشوت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کی تکمیل کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرے۔ قرآن نے اغراضِ باطلہ فاسدہ کے

حصول کے لئے رشوت دینے کو یہودیوں کے جرائم میں سے ایک جرم شمار کیا ہے۔ وہ اپنے پیٹ کی خاطر اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف تورات میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق فرمایا:۔

اُولٰئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ ۔ یہ یہود اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت دی کہ وہ یہود کی اس خصلت کو نہ اپنائیں۔ سورہ بقرہ میں فرمایا:۔

وَتُدْلُوْا بِھَا اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ ۔ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ۔ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ۔

یہ آیت اپنے ترجمہ کے ساتھ جس کو بعض مفسرین نے اختیار کیا ہے رشوت کی ممانعت و حرمت میں صاف و صریح ہے۔

حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

”رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت ہے۔“ (ابوداؤد)

رشوت دینے والے پر لعنت اس لئے ہے کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت بھی تو قانون و اخلاق کی رو سے جرم ہی ہے۔ اسلام نے رشوت کا دروازہ بند کرنے کے لئے اس قدر احتیاط کا حکم دیا ہے کہ جج و مجسٹریٹ صاحبان ہدیہ و تحفہ بھی قبول نہ کریں کیونکہ اس طرح جج و مجسٹریٹ کے وقار اور لوگوں کے اعتماد میں فرق پیدا ہوگا۔ (موطا امام مالک۔ کتاب المساواۃ)

مگر آج حالت یہ ہے کہ اللہ کے بندے خوب خوب رشوت لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں اور خدا سے ذرا نہیں ڈرتے اور پھر لطف یہ ہے کہ حرام کی کمائی ہوئی دولت سے جب عظیم الشّان محل بناتے ہیں تو اس کی پیشانی پر انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیتے ہیں ”ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ“ ایسے ہی

افراد کے لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا: ۔

لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ ۔

جو جسم حرام غذا اور ناجائز آمدنی سے پلا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ۔

یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَآءِ یَارَبِّ وَمَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُہٗ حَرَامٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذَالِکَ (مسلم شریف)

دور دراز کا سفر کر کے اس حال میں آئے کہ بال پراگندہ ہوں، سر سے پا تک غبار میں اٹا ہوا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ اے میرے رب! لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہو اور حرام مال ہی سے اس کی پرورش ہو تو اس حالت میں اس کی دعا کیوں کر قبول ہو گی۔

یہ ہے حرام روزی کمانے اور اس کو استعمال کرنے کا انجام کہ وہ ارحم الراحمین جو رب العلمین ہے اس کی بارگاہِ قدس میں ایسے شخص کے الحاح وزاری کے ساتھ اٹھے ہوئے ہاتھ بھی باریاب نہیں ہوتے۔

ناپ تول میں درستی اور صحت کی اہمیت

خرید و فروخت کے سلسلہ میں ناپ تول کی درستی کی بھی دین میں بڑی اہمیت ہے، اور قرآن مجید میں اس کی صحت و درستی پر بڑا زور دیا گیا ہے اور ناپ تول میں کمی بیشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ

اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

یہ ہی ہدایت حضرت شعیب علیہ السلام نے اہل مدین کو دی تھی جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر پر آباد تھے۔

وَلَاتَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْٓ اَرٰکُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ

اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں تم کو آسودہ دیکھتا ہوں۔ اور مجھے تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کے مرض میں خاص طور پر تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور چاہتے تو ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھا لیں گے مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ خیال غلط ہے جو لوگ اس جُرم کے مُرتکب ہوتے ہیں دنیا میں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی ساکھ جاتی رہتی ہے جو بالآخر بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور آخرت میں اس کی سزا جہنم ہے ہی۔ چنانچہ فرمایا :۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝

ویل ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

اور جب تم ناپ تول پورا دو۔ سیدھی ترازو سے تو لو تو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا اخیر کا ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے اور گو شروع میں کتنا ہی فائدہ ہو۔ مگر آخر میں یہ برائی کاروبار کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ پھر اس جرم کی سنگینی اس وقت تو بہت ہی بڑھ جاتی ہے جب کہ یہ بددیانتی کسی غریب و نادار سے کی جائے۔ اس ظالمانہ برتاؤ سے اس کے دل سے بددعائیں نہ نکلیں گی ؟

حضور سیّدِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا :۔

"مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔" (بخاری)

جھوٹی قسم سے اللہ عزّوجل کے مقدّس نام کی بے حرمتی ہوتی ہے

اپنی بات میں قوّت و صداقت پیدا کر کے اس کو منوانے کا جذبہ ہر شخص میں ہوتا ہے۔ بات اگر سچی ہو اور جہاں تک انسان کے علم کا تعلق ہے واقعے کے خلاف بھی نہ ہو تو بونتِ ضرورت اس بات میں مزید قوّت و صداقت پیدا کرنے کے لئے اللہ عزّوجل کے

نام کی قسم یاد کی جا سکتی ہے، اول تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی ٹھیک نہیں، پھر جھوٹی قسمیں کھانا اور وہ بھی اللہ عزّ وجل کے مقدّس نام پر یہ تو اور بھی بُری بات ہے۔

جھوٹی قسم دراصل جھوٹ کی بدترین قسم ہے کیونکہ اس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کے نام کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی لئے اس کو اہلِ نفاق کی حالت قرار دیا ہے۔

يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ منافقوں کی حالت یہ ہے کہ وہ جان بُوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔ (مجادلہ ۳)

اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (مجادلہ ۳) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مُرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اسلام نے اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپ نے فرمایا۔

"اگر اس نے قسم کھالی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب ملے گا تو خدا اس پر نظرِ رحمت نہ فرمائے گا" (مسلم)

لہٰذا معاملات میں جھوٹی قسموں سے بچنا بھی ضروری ہے۔

ان گزارشات سے اس امر کی کافی وضاحت ہو جاتی ہے کہ معاملات میں اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے اور کن امور کی پابندی کو لازم قرار دیتا ہے۔

کتاب و سنّت کی ان ہدایات سے یہ بھی واضح ہُوا کہ اللہ عزّ وجل کی رضا و رحمت حاصل کرنے اور سچا مسلمان بننے اور دین و دنیا میں کامیاب و کامران رہنے کے لئے جیسے نماز روزہ کی پابندی ضروری ہے۔ ایسے ہی معاملات کی درستی اور ذرائع آمدنی کی صحت و پاکی بھی نہایت ہی ضروری ہے۔ خدا ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلامی معاشرہ میں سلام کا مقام

دوستی اور پرخلوص تعلقات کو فروغ دینے کے لئے اسلام نے جن آداب و مراسم کی تعلیم دی ہے ان میں ایک سلام بھی ہے۔ سلام کرنا اسلامی معاشرہ کا ایک ایسا ہمہ گیر اور عمومی ادب ہے کہ جس کے دائرہ سے کوئی مسلمان باہر نہیں۔ دوست ہو یا عزیز۔ معمولی شناسا ہو یا قطعاً اجنبی۔ غریب ہو یا امیر۔ بادشاہ ہو یا فقیر۔ سب کو سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے کی ہدایت کی گئی۔ مگر افسوس ہماری حالت یہ ہے کہ اوّل تو سلام کرتے نہیں اور کریں بھی تو اکثر دیکھا گیا کہ جواب تک نہیں دیتے۔ حالانکہ سلام کا جواب دینا واجب ہے اور جواب نہ دینا گناہ ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا۔

اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ	جب تمہیں کوئی سلام کرے تو اس سے
مِنْهَا الخ	بہتر الفاظ میں جواب دو۔
فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا	جب گھروں میں داخل ہو تو ان کے اہل کو سلام کرو۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ	حضرت عبداللہ بن عمر سے ہے کہ ایک آدمی نے حضور
رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ	اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام کی کون سی
الْاِسْلَامِ خَیْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرِئُ	خصلت بہتر ہے، آپ نے فرمایا کھانا کھلانا اور سلام
السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ (بخاری)	کرنا جس کو تو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔

اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے، یہ سوال غالباً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں دو باتوں کو اسلام کی بہترین خصلت قرار دیا۔

کھانا کھلانا اور سلام کرنا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف یہ دو ہی بہترین خصلتیں ہیں بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اسلام کی بہترین خصلتوں میں سے یہ دو بھی ہیں۔ کھانا کھلانے کی اہمیت و افادیت کا کون انکار کر سکتا ہے خصوصاً غریب و نادار کو کھانا کھلانا ایک ایسا عمل ہے جو اللہ عزّوجل کو بہت ہی محبوب ہے۔ کتاب مجید میں یتیموں، مسکینوں، غریبوں کیلئے خوراک مہیا کرنے کی مؤثر انداز میں ترغیب دی گئی ہے اور دوستی اور پُرخلوص محبت کے حصول کیلئے سلام تو ایک نسخۂ کیمیا ہے ہی۔

سلام کی اہمیت اگرچہ دیگر اقوام میں بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ جب دو اشخاص ملتے ہیں یا ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو کسی اور گفت گو سے قبل کوئی لفظ یا فقرہ ایسا کہتے ہیں جو دوستی اور تعارف کو پیدا کرتا ہے مثلاً انگریزوں میں وقت کے تعلّق سے "گڈ مارننگ" اور "گڈ نائٹ" وغیرہ رائج ہیں اور متوجہ کرنے کے لئے "ہلو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ہندؤں میں رام رام یا اسی طرح کے اور الفاظ رائج ہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں وہ وسعت اور عمومیت نہیں ہے جو اسلام کے سلام میں پائی جاتی ہے۔ گڈ مارننگ کا مطلب روز بخیر ہے گویا یہ جملہ کہنے والا دعا دے رہا ہے کہ آپ کا دن خیریت سے گذرے۔ اسی طرح دوسرے الفاظ بھی وقت کے ساتھ مقید ہیں لیکن لفظ "سلام" کے مفہوم میں ہر طرح کی خیر و برکت، مسرت و راحت داخل ہے۔ اس میں نہ وقت کی قید ہے نہ زمانے کی۔ السّلام علیکم کہہ کر گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حق میں بطورِ دعا بہترین جذبات اور خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ اور "سلامتی ہو تم پر" کے ذیل میں دین و دنیا کی تمام راحتیں اور برکتیں آجاتی ہیں۔ غرضکہ اسلام کے سلام میں جو وسعت اور عمومیت ہے وہ دنیا کے کسی ضابطہ، تہذیب و نظام اور تمدن کے مقرر کردہ الفاظ میں نہیں ہے۔

سلام کا وسیع پس منظر (۱) پھر جہاں سلام باہمی ربط و ضبط بڑھانے کا مفید ذریعہ ہے۔ وہاں ایک وسیع ذہنی پس منظر اور بنیادی فکر کا اعلامیہ اور آئینہ بھی ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو تعلیم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِذَا لَقِیَ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْہِ تم میں سے کوئی جب اپنے مسلمان سے ملے تو چاہیے
(ابوداؤد) کہ سلام کرے ۔

ہادی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت دراصل اس امر کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں مسلمان بہی خواہی تعاون اور محبت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی ہوں جس سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تکلیف سے "تکلیف' راحت سے راحت محسوس ہونا اسلام کے تعلق سے لازمی امر بن جائے ۔ دو مسلمانوں میں خواہ ظاہری و مادی طور پر کوئی تعلق نہ ہو مگر صرف اسلام کا مقدس رشتہ ہی انہیں ایک دوسرے کا دوست مونس و غم گسار، ہمدرد و مشیر بنانے کیلئے کافی ہو۔ لہٰذا اس شان کے معاشرے والے ایک دوسرے کے قریب سے بالکل خاموش گذر جائیں تو یہ نہایت ہی غیر مناسب روش ہوگی۔ اسلئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کرنے کی ہدایت کی گویا "سلام" اس رشتہ کا آئینہ دار ہے جو ایک مسلم کو دوسرے مسلم سے صرف بحیثیت مسلم حاصل ہوتا ہے ۔ پھر اسلام میں اس کی وسعت و عمومیت کا یہ عالم ہے کہ حدیثِ زیرِ بحث میں فرمایا :-

وَتَقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَ جس سے تم واقف ہو اسے بھی سلام کرو اور جس سے
مَنْ لَمْ تَعْرِفْ ۔ تمہاری شناسائی نہیں ہے اسے بھی۔

یعنی سلام کرنے کیلئے پہلے سے شناسائی اور مادی و رسمی تعارف شرط نہیں ہے ۔ صرف اسلامی رشتہ کافی ہے ۔ کیونکہ "سلام" اسلام کے تعلق سے بڑھ کر کسی اور تعلق کو نہیں مانتا ۔ نسلی، جغرافیائی، طبقاتی، لسانی وغیرہ رشتے اس کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام کا رشتہ سب پر مقدم اور سب سے برتر و اعلیٰ ہے یہ رشتہ جہاں بھی ہوگا ان میں حقیقتاً کوئی اجنبیت نہ ہوگی لہٰذا ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے شناسائی ہو یا نہ ہو۔ وہ بہرصورت اس کو سلام کرے اور سلام ہر موقع و محل پر اس حقیقتِ ثابتہ کی یاد دلاتا ہے کہ اسلام و ایمان کا تعلق منقطع ہونے والا نہیں ہے یہ تعلق تمام تعلقات سے ارفع و اعلیٰ ہے ۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر السّلامُ علیکم کے جملہ پر غور کیجئے ۔ یہ اپنے اندر کتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے ۔ جہاں اس کا یہ مطلب ہے کہ سلام کرنے والا مخاطب کو یقین دلا رہا ہے کہ ہم تم اجنبی نہیں ہیں بلکہ ہمارے درمیان ایک مضبوط تعلّق ہے وہیں یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں اپنے کو تنہا مت سمجھو ۔ مَیں تمہارا بھائی ہوں رنج و راحت میں شریک ہوں ۔ تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تو میرا تعاون لو ۔ اور مخاطب کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ جواب میں واؤ کے اضافہ کے ساتھ یہی الفاظ دہرائے یعنی وعلیکم السّلام ۔ گویا جواب دینے والا یہ کہہ رہا ہے کہ تم جو میری سلامتی کے خواہشمند ہو تو مَیں بھی تمہاری سلامتی کا خواہشمند ہوں ۔

غور کیجئے ۔ کتنی راحت و محبّت مُضمر ہے اس سوال و جواب میں اور کتنا پُرامن اور راحت بخش ہو سکتا ہے وہ معاشرہ جہاں واقعتہً ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی سلامتی اور خیر و فلاح کا دل سے خواہشمند ہو اسی لئے قرآن پاک نے بھی مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی بطور تشبیہ نہیں بلکہ بطور امرِ واقعہ کہا ہے ۔

۳ ۔ افسوس بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات نے السّلام علیکم کے الفاظ کو رجعت پسندانہ قرار دے کر ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ جدید الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ اسلامی تصوّرات سے بُعد اور غیر اسلامی تہذیب و تمدّن سے قُربِ و شیفتگی کا نتیجہ ہے ورنہ عقلاً بھی السّلام علیکم سے بہتر اور جامع الفاظ کسی نظامِ تمدّن میں رائج نہیں ہیں خود حضور سیّدِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس کی تصریح فرمائی ۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جابرؓ ایک دفعہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور کہا عَلَیْکَ السَّلَامُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تَقُلْ عَلَیْکَ السَّلَامُ ظاہر ہے کہ علیک السلام میں لفظی تبدیلی کوئی نہیں صرف ترتیبِ الفاظ بدل دی گئی ہے مگر حضور علیہ السّلام نے یہ بھی گوارا نہ فرمایا لہٰذا لَا تَقُلْ کی واضح نہی سے معلوم ہُوا کہ الفاظ تو کیا ترتیب بدلنا بھی جائز نہیں ہے ۔

۴ ۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے عمران بن حصین کہتے ہیں ہم لوگ سلام سے پہلے بوقتِ مُلاقات یہ الفاظ کہا کرتے تھے ۔

اَنْعَمَ اللّٰہُ بِكَ عَيْنًا وَّ اُنْعِمْ صَبَاحًا (ابوداؤد) تیری آنکھوں کو اللہ ٹھنڈا رکھے اور تیری صبح نعمتوں کے ہجوم میں طلوع ہو۔

ظاہر ہے باعتبارِ مفہوم و معنیٰ آداب تسلیمات گڈمارننگ وغیرہ سے یہ جملے زیادہ مبارک اور خوشگوار ہیں لیکن حضور علیہ السّلام نے ان کی جگہ السّلام علیکم مقرر فرما کر یہ بتا دیا کہ السّلام علیکم نہایت جامع ہے اور یہ کہ مسلمان کو اغیار کے طریقوں کو چھوڑ کر اپنے اسلامی طریقہ کو اپنانا چاہیئے۔

۵۔ سلام کی مقدّس رسم کو شارع علیہ السّلام نے کبر و نخوت، علو پسندی، طبقاتی تفاوت اور اسی طرح کے فاسد رجحانات کی آبیاری میں استعمال ہونے سے کس شان سے روکا ہے اس کا اندازہ ذیل کی ہدایات سے ہو سکتا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں فرمایا۔

لِيُسَلِّمَ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ سوار پیادے کو سلام کرے۔

جب آدمی گھوڑے یا کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو نفسیاتی طور پر پیدل چلنے والوں کے مقابلہ میں اس کے اندر برتری اور شان کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پیادے کو حکم دیا جاتا کہ وہ سوار کو سلام کرے تو لازماً سواروں کے غلط احساسِ برتری و نخوت و تکبّر کو غذا ملتی۔ اس لئے ہادیٔ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار کے غلط احساسِ برتری کا علاج یوں فرمایا کہ وہ پیدل چلنے والوں کو سلام کرے اور پیدل چلنے والوں پر یہ اثر ڈالا کہ وہ خود کو صرف پیدل ہونے کی وجہ سے کمتر نہ سمجھیں کیونکہ اسلام میں بزرگی و بڑائی صرف تقویٰ و طہارت پر ہے نہ کہ دولت و ثروت اور دُنیاوی وجاہت و عزت پر۔

وَالْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ چلنے والا بیٹھنے والے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔

گویا اس کا لحاظ نہیں کیا جائیگا کہ چلنے والا کوئی ذی وجاہت اور با شوکت آدمی ہے لہٰذا جب وہ گذرے تو ہر وہ شخص اس کو سلام کرے جو عرفِ عام میں اس سے کم حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس گذرنے والے پر لازم ہے کہ وہ سلام میں پہل کرے اِسی طرح قلیل کثیر کو سلام کریں اس میں بھی سلام کی پہل کو طبقاتی

تفاوت اور فرقِ مراتب سے مشروط نہیں کیا بلکہ ایسا طریقہ مقرّر فرمایا کہ "سلام" کی پاکیزہ رسم سے کسی حال میں بھی کمتری و برتری کے احساسات کی آبیاری نہ ہو اسی لئے فرمایا:۔

یُسَلِّمُ الصَّغِیْرُ عَلَی الْکَبِیْرِ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

یعنی کم عمر سلام میں پہل کرے مگر یہ نہ دیکھے کہ زیادہ عمر والا رتبہ و حیثیت میں بڑھا ہوا ہے یا گھٹا ہُوا۔ چنانچہ مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السّلام لڑکوں کے پاس سے گذرے تو آپ نے انہیں سلام کیا۔ بظاہر حضور علیہ السّلام کا یہ طرزِ عمل سابقہ حدیث کے متعارض ہے مگر حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔ اولاً اس لئے کہ حضور علیہ السلام اس قدر شفیق تھے کہ ہر چھوٹے بڑے کیلئے دعا میں سبقت کرنا گویا آپ کے قلبِ اقدس کا تقاضا تھا چنانچہ بارہا آپ نے ان صحابہ کو سلام کیا جو بداہتہً آپ سے کم عمر تھے دوسرے آپ کا فرضِ نبوت یہ تھا کہ صرف قول ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی اسلامی آداب و ضوابط امّت کو سکھائیں چنانچہ لڑکوں کو سلام کی پاکیزہ رسم پر خصوصی توجّہ دینے کیلئے آپ نے انہیں سلام کیا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جس پر آدابِ اسلامی کی رُو سے سلام میں سبقت ضروری ہو۔ سبقت کو فراموش کر دے تو خود ہمیں اس کے انتقام میں سلام سے گریز نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ لازم ہے کہ خود سلام میں پہل کر کے اُسے بھُولا ہوا سبق یاد دلائیں اسی لئے فرمایا:۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَءَ بِالسَّلَامِ لوگوں میں اللہ سے زیادہ قریب وہ شخص ہے۔ جو سلام میں پہل کرے۔ (ابوداؤد)

یعنی سلام میں پہل کرنا کسی کمتری و بے حیثیتی کی علامت نہیں ہے بلکہ تقرب الی اللہ اور نیکی کا مظہر ہے۔

(۶) سلام کی مقدس رسمِ اسلام کو کس درجہ پسند ہے۔ اس کا اندازہ حدیثِ ذیل سے کیجئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کو ملے تو سلام کرے۔

فَاِنْ حَالَتْ بَیْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْ جِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِیَهٗ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ (ابوداؤد) پھر اگر اس باہمی سلام کے بعد درمیان میں کوئی درخت دیوار یا پتھر آجائے اور اسکے بعد پھر ملاقات ہو تو پھر سلام کرنا چاہیئے

گویا ہر ملاقات کے آغاز میں تجدیدِ سلام ہونا چاہیئے خواہ وہ ملاقات چند لمحوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو ایک مسلمان کو ہر صورت میں دوسرے مسلمان کے ساتھ ہمدردی بہی خواہی و عافیت طلبی کی نیک خواہش کا اظہار ضرور کر دینا چاہیئے اور سلام جیسی پاکیزہ دعا سے نہ چوکنا چاہیئے۔

افسوس ہمارے معاشرہ میں یہ عمل تقریباً متروک ہے صرف اس وقت تو سلام کر لیتے ہیں جب سفر سے واپسی ہو، یا پہلی بار ملاقات ہو ورنہ ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ کی ملاقات میں اسے نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے حالانکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تو یہ ہے۔

یَا بُنَیَّ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰی اَھْلِکَ فَسَلِّمْ یَکُوْنُ بَرَکَۃً عَلَیْکَ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِکَ (ترمذی)

اے بیٹے! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس پہنچے تو سلام کر یہ سلام تیرے اور تیرے گھر والوں کیلئے برکت کا باعث ہوگا۔

بیہقی کی حدیث میں فرمایا:۔

اِذَا دَخَلْتُمْ بَیْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِہٖ وَاِذَا خَرَجْتُمْ فَاَوْدِعُوْا اَھْلَہٗ بِسَلَامٍ (بیہقی)

جب گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کر اور جب گھر سے چلنے لگو تو انہیں سلام ہی سے رخصت کرو۔

(۱) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلم پر مسلم کے چھ حق ہیں۔ جب اس سے ملے سلام کرے۔ جب وہ بیمار ہو عیادت کرے۔ جب چھینکے جواب دے۔ جب بلائے اسکے پاس جائے۔ جب وہ مر جائے اسکے جنازہ کے ساتھ جائے اور جو چیز اپنے لئے پسند کرے وہی اس کے لئے پسند کرے۔ (ترمذی)

(۲) جو شخص پہلے سلام کرے وہ رحمتِ الٰہی کا زیادہ مستحق ہے۔ (ترمذی)

(۳) جو پہلے سلام کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہے (بیہقی)

(۴) ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے موقع پر بھی سلام کرو (ابوداؤد)

(۵) حضرت آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے جواب میں السلام علیکم کہا تھا (بخاری و مسلم)

(۶) سلام بات چیت کرنے سے پہلے کیا جائے۔ (ترمذی)

(۷) مجلس میں پہنچنے کے بعد اور مجلس سے واپسی پر دونوں مواقع پر سلام کرے۔ (ابوداؤد)

(۸) بچوں کو سلام کرو (مسلم)

(۹) چھوٹا بڑے کو۔ سوار پیدل کو۔ گذرنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ آدمیوں کو سلام کریں (مسلم)

(۱۰) اہلِ کتاب سلام کریں تو ان کے جواب میں صرف وعلیکم کہہ دیں۔ (مسلم)

(۱۱) راستہ کا حق یہ ہے نظر نیچی رکھنا تکلیف دہ چیز کو دور کرنا۔ سلام کا جواب دینا اچھی بات کا حکم اور بُری باتوں سے روکنا۔ (مسلم)

(۱۲) السّلام علیکم کہنے والے کے لئے دس نیکیاں۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے والے کیلئے بیس۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہنے والے کیلئے تیس۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ومغفرتہٗ کہنے والے کے حق میں چالیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ (ابوداؤد)

(۱۳) یہود و نصاریٰ سے تشبّہ نہ کرو۔ یہود کا سلام انگلیوں کے اشارہ سے ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں کے اشارہ سے۔ (ترمذی)

(۱۴) علیک السّلام مت کہو یہ مُردوں کی تحیت ہے بلکہ السّلام علیکم کہا کرو۔ (ابوداؤد)

سلام کے ضروری مسائل یہ اور اس مضمون کی احادیث سے فقہاء نے بہت سے مسائل اخذ کئے ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:-

۱۔ سلام کرنے میں مسلم کی عزت و آبرو اور مال و جان کی حفاظت کی نیت کرے۔

۲۔ ایک شخص کو سلام کرے تو اس کیلئے بھی جمع کا لفظ استعمال کرے یعنی السّلام علیکم کہے۔ جواب دینے والا بھی وعلیکم السّلام کہے۔ رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کے الفاظ کا اضافہ بہتر ہے صرف علیکم یا علیک نہ کہا جائے۔

۳۔ سلام کا جواب فوراً دینا واجب ہے بلا عذر تاخیر کی تو گنہگار ہوگا اور یہ گناہ جواب دینے سے دفع نہ ہوگا بلکہ توبہ کرنی ہوگی۔

۴۔ مجلس میں سے کسی ایک شخص کا جواب دیدینا اہلِ مجلس کی طرف سے کافی ہوجاتا ہے۔

۵۔ قاضی جب کہ عدالت میں اجلاس کررہا ہو اس کو کسی نے سلام کیا تو اس پر جواب دینا واجب نہیں۔

۶۔ جو شخص تلاوت میں یا درس و تدریس یا علمی گفتگو یا سبق کی تکرار کررہا ہو عالم دین وعظ کررہا ہے یا تعلیم میں مشغول ہے یا کوئی شخص ذکر میں مشغول ہے یا تقریر ہو رہی ہے اور لوگ سن رہے ہوں ان صورتوں میں سلام نہ کیا جائے۔

۷۔ جو شخص پیشاب، پاخانہ، کبوتر اڑانے یا حمام یا غسل خانہ میں ننگا نہا رہا ہے اسکو بھی سلام نہ کیا جائے فاسق کو بھی سلام نہ کرے۔ گمراہ بے دین کو سلام کرنا گناہ ہے۔

۸۔ کسی کا سلام پہنچانے کا وعدہ کرلیا ہے تو سلام پہنچانا واجب ہے۔

۹۔ ہتھیلی یا انگلی کے اشارے سے سلام کرنا ممنوع ہے۔

۱۰۔ یونہی اشارہ سے جواب دینا بھی ناکافی ہے منہ سے وعلیکم السلام کہنا واجب ہے۔

۱۱۔ رکوع کی حد تک جھک کر سلام کرنا حرام ہے اور اس سے کم جھکنا مکروہ ہے۔

۱۲۔ بندگی عرض ہے ان لفظوں سے سلام کرنا ناجائز ہے۔

۱۳۔ آداب عرض ہے گو اس میں اتنی برائی نہیں مگر سنت کے خلاف ہے تسلیمات اور تسلیم اور سلام یہ سلام ہی کے معنیٰ میں ہے مگر السلام علیکم کہنا بہرحال افضل ہے۔

۱۴۔ بچے جب سلام کریں تو عام طور پر جواب میں 'جیتے رہو' کہا جاتا ہے یہ ناکافی ہے۔ یہ جواب ایامِ جاہلیت میں کفار دیا کرتے تھے۔ اسی لئے اسلام نے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کا لفظ مقرر کیا ہے۔

۱۵۔ جب کوئی کسی کا سلام پہنچائے تو جواب اس طرح دیا جائے علیہ علیکم السلام

۱۶۔ نبی و فرشتہ کے نام کے علاوہ کسی اور نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیئے۔

۱۷۔ خط میں سلام لکھا ہوتا ہے اس کا جواب دینا بھی واجب ہے اور جواب کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ زبان سے

جواب دے یا دوسری صورت یہ ہے کہ سلام کا جواب لکھ کر بھیجدے۔ مگر چونکہ جواب سلام دینا واجب ہے اور تحریری جواب میں بہرصورت تاخیر ہوتی ہے اس لئے فوراً جواب دے دے تاکہ تاخیر سے گناہ نہ ہو۔ کافر کو سلام نہ کیا جائے اگر وہ سلام کریں تو جواب میں صرف وعلیکم یا علیک کہا جائے اور بقصد تعظیم کافر کو ہرگز سلام نہ کیا جائے کیونکہ کافر کی تعظیم کفر ہے۔ (درمختار)

١٨۔ اگر ایسی جگہ گذر ہو جہاں مسلم و کافر دونوں ہوں تو السّلام علیکم کہے اور غیر مسلموں کو سلام کا ارادہ نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ کہے۔

غیر مسلموں اور بدمذہبوں کو سلام کیا جائے ؟

غیر مسلموں اور بدمذہبوں کو سلام نہ کیا جائے۔ حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَا تَبۡدَءُوا الۡیَھُوۡدَ وَالنَّصَارٰی بِالسَّلَامِ یہود اور نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں جب انہیں سلام کرنے کی ممانعت ہے تو غیر اہل کتاب تو بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہوں گے۔ اسی طرح بدمذہب اور بے دین خصوصاً جن کے عقائد حد کفر تک پہنچ گئے ان کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ جب غیر مسلم ہمیں سلام کریں تو صرف "وَعَلَیۡکَ" کہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور یہ حکم کوئی تنگ نظری تنگ دلی اور بد اخلاقی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انصاف و دیانت اور خلوص و للہیت کا آئینہ دار ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ السّلام علیکم میں جس سلامتی کا ذکر ہے وہ اس محدود پیمانے کی سلامتی نہیں ہے جو صرف دنیا کی عیش و آرام امن و عافیت تک محدود ہو بلکہ اس میں آخرت کی فلاح و نجات عافیت و خیریت بھی شامل ہے یعنی السّلام علیکم یا وعلیکم السّلام کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ عزّ وجل تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں امن و عافیت عطا فرمائے ظاہر ہے کہ جب اہل کفر کے لئے قرآنی تصریحات کے مطابق آخرت کی فلاح و نجات ہے ہی نہیں تو انہیں سلامتی کی دعا دینا کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ جس سلامتی کے ہم اہل کفر کے لئے قائل ہی نہیں ہیں نہ یہ کہ صرف قائل ہو جائیں تو مسلمان ہی نہیں رہ سکتے۔ اسی سلامتی کی دعا اگر ہم اہل کفر کو دے دیں تو یہ منافقا

رواداری ہوگی اور مسلمان منافقانہ رواداری کا قائل نہیں ہے اور اس کو شرافت و نجابت اور اخلاق کے خلاف سمجھتا ہے اس لئے ہمیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پہل نہ کریں یعنی ان کو السّلام علیکم نہ کہیں اور اگر وہ ہمیں سلام کریں تو ہم صرف وعلیک جواب میں کہہ دیں اور اس وعلیک کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم پر سلامتی ہو بلکہ سلام کو حذف کر دینے کے بعد وعلیک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر بھی وہی کچھ ہو۔ جس کے تم مستحق ہو۔

البتہ جہاں غیر مسلموں کے ساتھ مل جُل کر رہنا پڑتا ہے یا ان کی حکومت ہوتی ہے اور ان سے ربط و ضبط ناگُزیر ہوتا ہے وہاں "آداب عرض ہے" ایسے جملے استعمال کر سکتے ہیں جن میں کوئی شرعی خرابی کا پہلو نہ نکلتا ہو لیکن السّلام علیکم کے الفاظ بہر صورت نہیں کہیں گے اسی طرح وہ الفاظ بھی نہیں استعمال کر سکتے جو غیر اسلامی ثقافت کا جزو بن گئے ہیں جیسے نمستے رام رام یا جے بھارت وغیرہ۔

مُصافحہ و مُعانقہ باہمی محبّت و اُلفت اور مخلصانہ دوستی چونکہ اسلام کو بہت پسند ہے اس لئے اسلام نے ایسے متعدد معاشرتی آداب کی ترغیب دی جو بجائے خود دلی تعلق کے مظہر ہیں اور جن سے دلی تعلق میں ثبات اور اضافہ ہوتا ہے۔ مصافحہ و معانقہ بھی انہیں میں کا ایک ادب ہے۔ حضور سیّدِ عالم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَامِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَّتَفَرَّقَا۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)	جب بھی دو مسلمان باہم ملتے اور مصافحہ کرتے ہیں ان پر جدا ہونے سے قبل ہی بخشش کی جاتی ہے۔
عَنْ قَتَادَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَنَسٍ اَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِىْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ (رواہ البخاری)	حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کیا رسول اللہ کے اصحاب میں مصافحہ کا رواج تھا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں تھا۔

مطلبِ حدیث یہ نہیں ہے کہ بس مصافحہ کیا اور مغفرت ہو گئی بلکہ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مصافحہ بھی اللہ

کے نزدیک ایک پسندیدہ فعل ہے اور کارِ ثواب۔ چنانچہ ایک اور حدیث کا مضمون ہے۔

"جب دو مسلمان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان پر سو رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ نوے پہل کرنے والے پر اور دس دوسرے پر۔"

مسنون یہ ہے کہ جب دو مسلمان باہم ملیں تو پہلے سلام کریں اس کے بعد مصافحہ اسی طرح معانقہ بھی جائز ہے جب کہ خوفِ فتنہ نہ ہو متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معانقہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب زید بن حارثہ مدینہ آئے تو حضور نے (فاعتنقہ) ان سے معانقہ کیا (ترمذی)

دوسری روایت حضرت جعفر ابن ابی طالب کی ہے۔ حبش سے واپس ہوئے تو عین فتحِ خیبر کے دن مدینے پہنچے۔ فرماتے ہیں:۔

فَتَلَقَّانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ پس ہم سے ملاقات فرمائی رسول اللہ نے اور گلے سے
فَاعْتَنَقَنِیْ (شرح السنہ) لگایا مجھ کو۔ (شرح السنہ)

بوقتِ ملاقات اور نماز کے بعد خصوصاً عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کا مسلمانوں میں رواج ہے۔ یہ بھی خوشی و مسرت کے اظہار کا ایک طریقہ اور باہمی دوستی و تعلق کی ایک نشانی اور علامت ہے۔

مصافحہ تو مسنون ہے ہی لیکن معانقہ کے جائز و مشروع ہونے میں بھی تو کوئی شبہ نہیں ہے بعض لوگ عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ کو ناجائز بلکہ بدعت تک قرار دے دیتے ہیں یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

"دنیا ایک بازار ہے جو عنقریب بند ہو جائے۔ مخلوق پر نظر رکھنے کے دروازوں کو بند کر دو اور حق تعالیٰ پر نظر رکھنے کے دروازے کھول دو۔"

وقف اور اس کے احکام

ذیل میں فقہ اسلامی کی معتبر کتب سے وقف کے چیدہ چیدہ احکام و مسائل پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر تمام ہی مکتبۂ فکر کے علماء متفق ہیں اور اوقاف کے سب سے پہلے ناظم اعلیٰ نے سب سے پہلے جو میٹنگ بلائی تھی اور جس میں تمام مکتبہ فکر کے علماء نے شرکت کی تھی۔ اس میٹنگ میں مندرجہ ذیل احکام و مسائل بڑی وضاحت ساتھ علماء نے پیش کر دیئے تھے اور ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے ان پر عمل کرنے اور محکمہ کو شریعت کے احکام کے مطابق چلانے کا حتمی وعدہ بھی کیا تھا۔

وقف کے معنی | وقف کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی شے کو اپنی ملکیت سے خارج کر کے خالص اللہ عزوجل کی ملک کر دینا اس طرح کہ اس کا نفع بندگانِ خدا میں سے جس کو چاہے ملتا رہے۔

وقف کا حکم | وقف کا حکم یہ ہے کہ نہ خود وقف کرنے والا اس کا مالک ہے نہ دوسرے کو اس کا مالک بنا سکتا ہے نہ اس کو بیع کر سکتا ہے نہ عاریتہً دے سکتا ہے نہ اس کو رہن رکھ سکتا ہے۔ (درمختار، عالمگیری)

وقف کی صحت کیلئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے لئے متولّی مقرر کرے اور اپنے قبضہ سے نکال کر متولّی کا قبضہ دلا دے بلکہ واقف نے اگر اپنے ہی قبضہ میں رکھا جب بھی وقف صحیح ہے۔

وقف کو اختیار ہے کہ جس قسم کی چاہے شرط لگائے | واقف کو اختیار ہے جس قسم کی چاہے وقف میں شرط لگائے اس کا اعتبار ہوگا۔ ہاں ایسی شرط لگائی جو خلاف شرع ہے تو یہ شرط باطل ہے اور اس کا اعتبار نہیں (ردالمحتار)

واقف نے یہ شرط کی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں کل آمدنی یا اس کے اتنے جز کا مستحق ہوں اور میرے بعد فقراء کو ملے یا یہ شرط کی کہ آمدنی سے میرا قرض ادا کیا جائے۔ پھر فقرا کو یا یہ کہ میری زندگی تک میں لوں گا۔

پھر قرض ادا ہو گا۔ پھر فقراء کو ملے۔ یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ (عالمگیری)

شخص مذکور نے اپنی جائداد اس طرح وقف کی کہ میں جب تک زندہ رہوں اس کی آمدنی اپنی ذات پر صرف کرتا رہوں اور میرے بعد مساکین یا مسجد یا مدرسہ میں صرف ہوں تو محققین کے نزدیک وقف صحیح ہے (فتح القدیر)

واقف نے اپنے لئے شرط کی اس کی آمدنی میں خود بھی کھاؤں گا اور دوست احباب مہمانوں کو بھی کھلاؤں گا۔ اس سے جو بچے فقراء کے لئے ہے اور اس طرح اپنی اولاد کے لئے نسلاً بعد نسلٍ یہی شرط لگائی تو وقف و شرط دونوں جائز۔ (عالمگیری)

وقف میں شرط کی کہ فلاں وارث کو وقف کی آمدنی سے بقدرِ کفایت دیا جائے تو جب تک یہ تنہا ہے تنہا کے لائق مصارف دیئے جائیں گے اور جب بال بچوں والا ہو جائے تو اتنا دیا جائے کہ سب کے لئے کافی ہو کر ان سب کے مصارف اسی کے ساتھ شمار ہوں گے۔ (عالمگیری)

یہ شرط کی کہ متولی کو اختیار ہے جب چاہے اس جائداد کو بیچ ڈالے اور اس کے داموں دوسری زمین خرید لے تو یہ شرط جائز ہے اور ایک دفعہ تبادلہ کا حق حاصل ہے۔ (در مختار)

واقف نے وصیّت کی کہ میرے بعد میرا لڑکا متولی ہو گا اور واقف کے مرنے کے وقت لڑکا نابالغ ہے تو جب تک نابالغ ہے دوسرے شخص کو متولی کیا جائے اور بالغ ہونے پر لڑکے کو تولیت دی جائے اور اگر اپنی تمام اولادوں کیلئے تولیت کی وصیّت کی ہے اور ان میں کوئی نابالغ بھی ہے تو نابالغ کے قائم مقام بالغین میں سے کسی کو یا کسی دوسرے شخص کو قاضی مقرر کر دے۔ (رد المحتار)

واقف کی شرائط میں ردّ و بدل جائز نہیں ہے اوقاف میں نیا وظیفہ مقرر کرنے کا قاضی کو بھی اختیار نہیں ہے یعنی ایسا وظیفہ جو واقف کی شرائط میں نہیں ہے تو شرائط کے خلاف مقرر کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہو گا اور جس کیلئے مقرر کیا گیا ہے اس کو لینا بھی ناجائز ہے۔ (در مختار)

مسجد کا متولی موجود نہ ہو تو اہلِ محلہ کو اوقافِ مسجد میں تصرف کرنا مثلاً دوکانات وغیرہ کو کرایہ پر دینا

پھر قرض ادا ہوگا۔ پھر فقراء کو ملے۔ یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ (عالمگیری)

شخص مذکور نے اپنی جائداد اس طرح وقف کی کہ میں جب تک زندہ رہوں اس کی آمدنی اپنی ذات پر صرف کرتا رہوں اور میرے بعد مساکین یا مسجد یا مدرسہ میں صرف ہوں تو محققین کے نزدیک وقف صحیح ہے (فتح القدیر)

واقف نے اپنے لئے شرط کی اس کی آمدنی میں خود بھی کھاؤں گا اور دوست احباب مہمانوں کو بھی کھلاؤں گا۔ اس سے جو بچے فقراء کے لئے ہے اور اس طرح اپنی اولاد کے لئے نسلاً بعد نسلٍ یہی شرط لگائی تو وقف و شرط دونوں جائز۔ (عالمگیری)

وقف میں شرط کی کہ فلاں وارث کو وقف کی آمدنی سے بقدرِ کفایت دیا جائے تو جب تک یہ تنہا ہے تنہا کے لائق مصارف دیئے جائیں گے اور جب بال بچوں والا ہو جائے تو اتنا دیا جائے کہ سب کے لئے کافی ہو کہ ان سب کے مصارف اسی کے ساتھ شمار ہوں گے۔ (عالمگیری)

یہ شرط کی کہ متولی کو اختیار ہے جب چاہے اس جائبداد کو بیچ ڈالے اور اس کے داموں دوسری زمین خرید لے تو یہ شرط جائز ہے اور ایک دفعہ تبادلہ کا حق حاصل ہے۔ (درمختار)

واقف نے وصیت کی کہ میرے بعد میرا لڑکا متولی ہوگا اور واقف کے مرنے کے وقت لڑکا نابالغ ہے تو جب تک نابالغ ہے دوسرے شخص کو متولی کیا جائے اور بالغ ہونے پر لڑکے کو تولیت دی جائے اور اگر اپنی تمام اولادوں کیلئے تولیت کی وصیت کی ہے اور ان میں کوئی نابالغ بھی ہے تو نابالغ کے قائم مقام بالغین میں سے کسی کو یا کسی دوسرے شخص کو قاضی مقرر کر دے۔ (ردالمحتار)

واقف کی شرائط میں ردّ و بدل جائز نہیں ہے اوقاف میں نیا وظیفہ مقرر کرنے کا قاضی کو بھی اختیار نہیں ہے یعنی ایسا وظیفہ جو واقف کی شرائط میں نہیں ہے تو شرائط کے خلاف مقرر کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا اور جس کیلئے مقرر کیا گیا ہے اس کو لینا بھی ناجائز ہے۔ (درمختار)

مسجد کا متولی موجود نہ ہو تو اہلِ محلہ کو اوقافِ مسجد میں تصرف کرنا مثلاً دکانات وغیرہ کو کرایہ پر دینا

جائز نہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کر لیا اور مسجد کے مصالح کے لحاظ سے بھی بہتر تھا تو حاکم انکے تصرف کو نافذ کردیگا (عالمگیری)

واقف کو اختیار ہے کہ متولی کو معزول کرکے دوسرا متولی مقرر کردے یا خود اپنے آپ متولی بن جائے۔ (فتح القدیر)

واقف نے شرط کی ہے کہ وقف کا متولی میری اولاد میں سے اسکو کیا جائے جو سب میں ہوشیار نیکوکار ہو تو اس شرط کا لحاظ رکھتے ہوئے متولی مقرر کیا جائے۔ اسکے خلاف متولی کرنا صحیح نہیں ہے۔ (رد المحتار)

واقف نے جس کو متولی کیا ہے وہ جب تک خیانت نہ کرے قاضی اسلام اس کو معزول نہیں کر سکتا اور اگر بلا وجہ قاضی نے معزول کرکے دوسرے کو اس کی جگہ متولی کر دیا تو دوسرا متولی نہیں ہوگا وہ پہلا بدستور متولی ہے اور اگر قاضی نے متولی مقرر کیا تو بغیر خیانت ثابت ہونے بھی اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ (رد المحتار)

مختلف مسائلِ وقف وقف کی عمارت منہدم ہوگئی پھر اس کی تعمیر ہوئی اور پہلے کا کچھ سامان بچا ہوا ہے تو اگر یہ خیال ہو کہ آئندہ ضرورت کے وقت اسی وقف میں کام آسکتا ہے جب تو محفوظ رکھا جائے ورنہ فروخت کر کے قیمت کو مرمت میں صرف کریں۔ اور اگر یہ رکھ چھوڑنے میں ضائع ہونے کا اندیشہ ہو جب بھی فروخت کر ڈالیں اور ثمن کو محفوظ رکھیں۔ یہ چیزیں خود ان لوگوں کو نہیں دی جا سکتیں جن پر وقف ہے (در مختار) (عالمگیری)

کسی نے اپنی جائداد مصالحِ مسجد کیلئے وقف کی ہے تو امام، موذن، جاروب کش، فراش، دربان، چٹائی، جانماز، قندیل، تیل، روشنی کرنے والا۔ وضو کا پانی، لوٹے، رسی، ڈول، پانی بھرنے والے کی اجرت، اس قسم کے مصارف مصالح میں شمار ہوتے ہیں۔ (در مختار)

مسجد چھوٹی بڑی ہونے سے ضروریات و مصالح کا اختلاف ہوگا۔ مسجد کی آمدنی کثیر ہے کہ ضروریات سے بچ رہتی ہے تو عمدہ نفیس جانماز خریدنا بھی جائز ہے چٹائی کی جگہ دری یا قالین کا فرش بچھا سکتے ہیں (بحر)

مدرس یا طالب علم حج فرض کیلئے گیا تو اس غیر حاضری کی وجہ سے معزول کئے جانے کا مستحق نہیں بلکہ اپنا وظیفہ بھی پائے گا۔ (در مختار)

مسلمانوں پر کوئی حادثہ آپڑا جس میں روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اس وقت روپیہ کی کوئی

بیل نہیں ہے مگر اوقاف مسجد کی آمدنی جمع ہے اور مسجد کو اس وقت حاجت بھی نہیں تو بطورِ قرض مسجد سے رقم لی جا سکتی ہے ۔

اگر امورِ خیر کیلئے وقف کیا اور یہ کہا کہ آمدنی سے پانی کی سبیل لگائی جائے یا لڑکیوں اور یتامیٰ کی شادی کا امان کردیا جائے یا کپڑے خرید کر فقیروں کو دیئے جائیں یا ہر سال آمدنی صدقہ کردی جائے یا زمین وقف دی کہ اس کی آمدنی جہاد میں صرف کی جائے یا مجاہدین کا سامان کردیا جائے یا مُردوں کے کفن دفن میں صرف جائے یہ سب صورتیں جائز ہیں ۔ (عالمگیری)

واقف نے کسی کو متولی نہیں کیا ہے اور قاضی نے مقرر کردیا تو واقف اب اسے جدا نہیں کرسکتا اند لّی موجود ہے خواہ واقف نے اسے مقرّر کیا یا قاضی نے تو بلا وجہ قاضی بھی دوسرا متولّی مقرّر نہیں کرسکتا (ردالمحتار)

متولّی فوت ہوگیا اور واقف زندہ ہے تو دوسرا متولّی خود واقف ہی مقرّر کریگا اور واقف بھی مرچکا ہے س کا وصی مقرر کریگا اور وصی بھی نہ ہو تو اب قاضی کا کام ہے بہ اپنی رائے سے مقرّر کرے گا ۔

متولّی وقف کے کام کیلئے ملازم نوکر رکھ سکتا ہے اور ان کی تنخواہ دے سکتا ہے اور ان کو موقوف کے ان کی جگہ دوسرے رکھ سکتا ہے ۔

مسجد پر قرآن مجید وقف کیا تو اس مسجد میں جس کا جی چاہے اسکی تلاوت کرسکتا ہے ۔ دوسری جگہ جانے کی اجازت نہیں کہ اس طرح پر وقف کرنے والے کا منشا یہی ہوتا ہے اور اگر واقف نے ریح کردی کہ اسی مسجد میں تلاوت کی جائے جب تو بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کی شرط کے خلاف نہیں جا سکتا ۔ (عالمگیری ، ردالمحتار)

وقف کی آمدنی کا سب میں بڑا مصرف یہ ہے کہ وہ وقف کی عمارت پر صرف کی جائے ۔ اس کے ے یہ بھی ضروری نہیں کہ واقف نے اس پر صرف کرنے کی شرط کی ہو یعنی شرائطِ وقف میں اس کو نہ بھی لیا ہو جب بھی صرف کریں گے کہ اس کی مرمت نہ کی جائے تو وقف ہی جاتا رہے گا ۔ عمارت پر صرف کرنے

سے یہ مراد ہے کہ اس کو خراب نہ ہونے دیں۔ اس میں اضافہ کرنا عمارت میں داخل نہیں۔ مثلاً مکان وقف ہے یا مسجد پر کوئی جائداد وقف ہے تو اولاً آمدنی کو خود مکان یا جائداد پر صرف کریں گے اور واقف کے زمانہ میں جس حالت میں تھی اس پر باقی رکھیں۔ اگر اس کے زمانہ میں سپیدی یا رنگ کیا جاتا ہے تو اب بھی مالِ وقف سے کریں۔ ورنہ نہیں۔ یونہی کھیت وقف ہے اور اس میں کھاد کی ضرورت ہے ورنہ کھیت خراب ہو جائے گا تو اس کی درستی مستحقین سے مقدم ہے۔ (عالمگیری۔ درمختار)

عمارت کے بعد آمدنی اس چیز پر صرف ہو جو عمارت سے قریب تر اور باعتبارِ مصالح مفید تر ہو کہ یہ معنوی عمارت ہے جیسے مسجد کیلئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرس کہ ان سے مدرسہ و مسجد کی آبادی ہے ان کو بقدرِ کفایت وقف کی آمدنی سے دیا جائے۔ پھر چراغ بتی اور فرش اور چٹائی اور دیگر ضروریات میں صرف کریں جو اہم ہو اسے مقدم رکھیں اور یہ اس صورت میں ہے کہ وقف کی آمدنی کسی خاص مصرف کیلئے معین نہ ہو اور اگر معیّن ہے مثلاً ایک شخص نے وقف کی آمدنی چراغ بتی کے لئے معین کر دی ہے یا وضو کے پانی کے لئے تعیّن کر دی ہے تو عمارت کے بعد اسی مد میں صرف کریں جس کے لئے معیّن ہے (عالمگیری رد المحتار)

واقف نے اس طور پر وقف کیا ہے کہ اس کی آمدنی ایک یا دو سال تک فلاں کو دی جائے۔ اس کے بعد فقرا پر صرف ہو اور یہ شرط بھی ذکر کی ہے کہ اس کی آمدنی سے مرمت وغیرہ کی جائے تو اگر عمارت میں صرف کرنے کی شدید ضرورت ہو کہ نہ صرف کرنے میں عمارت کو ضرر پہنچ جانا ظاہر ہے۔ جب تو عمارت کو مقدّم کریں گے ورنہ مقدّم اس شخص کو دینا ہے۔ (عالمگیری)

تصوّر جب تصویر بن کر سامنے آجائے تو پھر حسن بھی جمال بھی کرم بھی جلال بھی ناز بھی انداز بھی عشوہ بھی غمزہ بھی رعنائی بھی دل ربائی بھی سبھی کا تو لطف آجاتا ہے:

(م۔۱۷۰)

قصیدہ بردہ شریف

قصیدہ بردہ شریف حضور سرورِ کائنات علیہ التسلیم والصلوات کی مدح و ثنا پر مشتمل اشعار کا مجموعہ ہے یہ قصیدہ مبارکہ کم از کم نو سو برس یا اس سے کچھ زائد مدت سے صوفیا، و اولیا میں معمولاً جاری ہے اور بطور وظیفہ پڑھا جاتا ہے۔

قصیدۂ بُردہ کے مصنف کا نام علامہ شرفُ الدّین محمد بوصیری مصری ہے۔ یہ قریہ بوصیر کے رئیس اور علومِ عربیہ کے متبحّر عالم اور فصاحت و بلاغت میں مشہور و معروف تھے، ابتدائے عمر میں آپ اپنی خداداد قابلیت اور تبحّر علمی کی وجہ سے سلاطینِ اسلامیہ کے مقرب و محبوب تھے اور امرا کی منقبت اور قصیدہ گوئی میں خاص حصہ لیتے تھے وران کے اعدا کی ہجو میں رجز اور قصائد لکھا کرتے تھے۔

ایک روز آپ دربارِ سلطانی سے اپنے گھر تشریف لا رہے تھے کہ ایک بزرگ ملے اور انہوں نے فرمایا:

"بوصیری! تم نے کبھی خواب میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی کی؟"

علامہ بوصیری نے نفی میں جواب دیا۔ بس اس جواب کے بعد آپ پر ایک کیفیت طاری ہوئی۔ حضور کے عشق و محبّت کا جذبہ اتنا متلاطم ہُوا کہ اپنے دل میں حضور کی محبّت کے سوا اور کچھ نہ پاتے تھے۔ گھر آ کر جب سوئے تو نصیب جاگے اور اسی شب جمالِ جہاں آرائے محبوبِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت سے مشرّف ہوئے۔ آپ نے حضورِ اکرم کو صحابہ کے جھرمٹ میں اس شان سے دیکھا جیسے چاند ستاروں میں نظر آتا ہے۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو محبّتِ نبوی سے دل کو لبریز پایا اور اب آپ امراء و سلاطین کی مدح و ثنا کی بجائے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی شانِ عالی میں مدحیہ قصیدے لکھنے لگے۔ چنانچہ قصیدہ مضریہ و ہمزیہ اسی زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

کچھ دن بعد اچانک آپ پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور آپ کا نصف حصۂ جسم بے کار ہو گیا۔ اس مصیبت حالت میں ان کے ضمیر نے مشورہ دیا کہ سرکارِ دو عالم کی شان میں ایک قصیدہ لکھو اور اس کے ذریعہ بابِ الشفا سے اپنے لئے شفا طلب کرو۔

چنانچہ اسی کرب و بے چینی کے عالم میں آپ نے ایک قصیدہ لکھا جس کا نام قصیدہ بُردہ ہے قص لکھنے کے بعد جب سوئے تو خواب میں زیارت سے مشرف ہوئے اور آپ نے اسی عالمِ رویا میں یہ قص بارگاہِ نبوت میں پیش کیا جو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور قصیدہ سننے کے بعد حضو نے ان کے فالج زدہ اعضاء پر دستِ مبارک پھیرا۔ جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے آپ کو بالکل صحتیاب

اسی خوشی و مسرّت میں علامہ بوصیری علی الصّباح بے اختیار مکان سے باہر آئے۔ راستہ میں حضرت شیخ ابوالرّجاء سے جو اپنے وقت کے قطب الاقطاب تھے ملاقات ہوئی۔

انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا۔ " بوصیری! مجھے بھی وہ قصیدہ سناؤ جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت میں تم نے تالیف کیا ہے۔"

علّامہ بوصیری کہتے ہیں اس قصیدہ شریف کا علم سوا میرے کسی کو نہ تھا۔ میں نے عرض کی۔ حضرت کونس قصیدہ سناؤں۔ میں نے اکثر مدحیہ قصیدے لکھے ہیں۔

فرمایا۔ بوصیری! وہی قصیدہ سناؤ جس کا پہلا شعر یہ ہے

اَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ

میں نے حیرت سے عرض کی ۔" اے ابوالرّجا! یہ قصیدہ آپ نے کہاں سے یاد کیا۔ یہ قصیدہ تو میں نے سوائے اپنی سرکار کے کسی کو نہیں سنایا ہے۔"

شیخ ابوالرّجاء نے فرمایا:۔

"بوصیری! ہاں وہی قصیدہ سناؤ جو تم نے گزشتہ شب بارگاہِ نبوت میں پیش کیا تھا۔ بوصیری!

ہیں نے یہ قصیدہ شب گزشتہ ہی سنا ہے۔ تم یہ قصیدہ دربارِ نبوت میں عرض کر رہے تھے اور سرکار اس کو سن کر پسندیدگی کیلئے پھلوں سے بھری ہوئی ڈالی کی طرح ایسے تمایل فرما رہے تھے جیسے وہ ڈالی نسیم ریاح کی حرکت سے ہلنے لگتی ہے۔"

علامہ بوصیری کہتے ہیں۔ یہ جواب پا کر میں نے علی الفور یہ قصیدہ ان کو سنایا۔ وہ بہت مسرور ہوئے ں اس کے بعد سارے شہر میں اس قصیدہ کی دھوم مچ گئی۔

صاحب السّوارد الفردہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ شدہ شدہ اس واقعہ کی اطلاع ملک الظاہر کے وزیر ؤالدّین تک پہنچی۔ انہوں نے قصیدہ شریف کی نقل کی اور عہد کیا کہ اس قصیدہ مبارکہ کو روزانہ برہنہ پا کھڑے رسنوں گا چنانچہ اس کی برکت سے اس کے بہت سے کام پورے ہوئے۔

پھر سعدالدین فاروقی وزیر موصوف کے فرمان نویس کو آشوب چشم ہوا۔ حتیٰ کہ بصارت جاتے رہنے کا یشہ ہو گیا خواب میں کسی نے کہا کہ بہاؤالدّین سے قصیدہ بردہ لیکر آنکھوں سے لگاؤ۔

وہ گئے۔ اور خواب بیان کیا۔

بہاؤالدّین نے کہا۔ بردہ تو معلوم نہیں۔ البتہ حضورِ اکرم سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدحیہ ارکا ایک مجموعہ میرے پاس ہے جو شفائے امراض میں خاص اثر رکھتا ہے۔

چنانچہ سعدالدین نے وہ قصیدہ لیا۔ آنکھوں سے لگایا اور پڑھوا کر سنا علی الفور صحت یاب ہو گئے

ین کرام کے لئے اس قصیدہ مبارکہ کے چند اشعار مع ترجمہ کے پیش کئے جا رہے ہیں۔

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَسَیْفٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ	ترجمہ: حضور برہنہ تلوار ہیں اور اس کی چمک دمک سے
مُہَنَّدٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلٌ	نورِ ہدایت عالم میں پھیل رہا ہے۔
نَبِیُّنَا الْاٰمِرُ وَالنَّاھِیْ فَلَا اَحَدٌ	ترجمہ: ہمارے نبی حکم دینے والے نہی فرمانے والے ہیں کہ آپ کا
اَبَرَّ فِیْ قَوْلِ لَا مِنْہُ وَلَا نَعَمٖ	مثل کوئی نہیں صدقِ وعدہ میں اور "ہاں" اور "نا" میں۔

۳- وَكُلُّ اٰيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا
فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمِ

ترجمہ: تمام معجزات جو انبیاء کرام سے ظاہر ہوئے وہ سب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ پاک کی لمعانیت و تابانیت سے حاصل ہوئے۔

۴- فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيْهِ اَنَّهٗ بَشَرٌ
وَاَنَّهٗ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ

ترجمہ: حضور کے متعلق ہمارا انتہاءِ علم یہ ہے کہ وہ بشر ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ تمام مخلوقاتِ الٰہیہ سے افضل و اعلیٰ ہیں

۵- فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا
يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

ترجمہ: ہمارے حضور فضل و شرف کے سورج ہیں اور تمام انبیاء کرام اسی آفتاب سے فیض پانے والے ستارے ہیں جو تاریکی میں روشنی دکھاتے چلے آئے ہیں۔

۶- وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهٗ
قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

ترجمہ: کوئی دنیا میں حضور کی حقیقت کو کیسے جان سکتا ہے جب کہ قوم دنیا کے خوابِ غفلت میں سو رہی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

۷- دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمِ
وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

ترجمہ: بس حضور کی ایسی مدح نہ کر جو عیسائیوں نے اپنے نبی کی شان میں کہی کہ (ابن اللہ بنا ڈالا) لیکن اس کے سوا (جو فضل و شرف اور کمال حضور کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کرنا چاہے) اور آپ کی مدح میں کہنا چاہے حکم لگا اور فیصلہ کر کے کہہ۔

درد بیماری نہیں دولۓ بیداری ہے جس سے قلبی لگاؤ ہوتا ہے درد میں اسی کی یاد آتی ہے۔ (م ر)

حبِ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم

شرطِ ایمان ہے

حضور سیّد المرسلین خاتم النبیّین محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے علیہ التحیۃ والثناء فرماتے ہیں:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ ۔ (بخاری)

مجھے اس ذاتِ مقدس کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جبتک کہ وہ مجھے اپنے والد اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ جانے

اس حدیث کو امام مسلم و نسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے نسائی کی روایت میں مِنْ مَّالِہٖ وَ اَھْلِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ کے لفظ بھی آئے ہیں (۲) الرسول میں الف لام عہدی ہے اور اس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام سے محبت رکھنا ان کی تعظیم و توقیر کرنا اور ان کی نبوتوں پر ایمان لانا واجب ہے بلکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تمام انبیا علیہم السلام سے محبت کو مستلزم ہے بلکہ حضور علیہ السلام سے محبت تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبت کو بھی مستلزم ہے وَالَّذِیْ میں واو قسم کے لئے ہے حَتّٰی غایت کے بیان کے لئے ہے۔ اَحَبَّ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور قسم کلام میں تاکید اور قوت کو پیدا کرنے کے لئے ہے

اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی اہم امر کو بیان کرنے کیلئے قسم کا استعمال جائز ہے ید، ہاتھ اللہ تعالیٰ ہاتھ وغیرہ سے پاک ہے اور یہ لفظ متشابہات سے ہے۔ قرآنِ حکیم میں بھی اللہ عزوجل نے اپنی طرف ید، ہاتھ وغیرہ کی نسبت کی ہے متشابہات سے متعلق علماء کی دو رائیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ پر ہمارا ایمان ہے اور اس کے اصل مفہوم کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ دوسرا طبقہ مؤولین کا ہے جو اس قسم کے الفاظ کا ایسا معنی کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی شایانِ شان ہو مثلاً جہاں ید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس سے مُراد وہ طاقت و حکومت اور اختیار لیتے ہیں تو اب حدیث کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے اختیار میں میری جان ہے۔

حضورِ اکرم علیہ السلام کی محبت عینِ ایمان ہے لَا یُؤْمِنُ : تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ اس کا مطلب قطعاً یہ ہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بغیر ایمان کا پایا جانا ناممکن ہے۔ ہر شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے فہم و عقل کی دولت دی ہے وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ جس کے ساتھ عقیدت و نیازمندی ایمان میں داخل ہو اور بغیر اس کے مانے ہوئے آدمی مومن نہ ہو سکے۔ اس کی محبت ساری کائنات سے زیادہ ضروری ہوگی۔ ماں باپ اولاد عزیز و اقارب کے انسان پر حقوق ہیں اور ان کا ادا کرنا لازم ہے لیکن اگر کوئی شخص ان سب کو بھول جائے اور اس کے دل میں ان کے لئے بالکل محبت و الفت باقی نہ رہے اور ان سب سے بے تعلق ہو جائے تو اس کے ایمان میں خلل نہ آئے گا کیونکہ ایمان لاتے ہیں۔ ماں باپ عزیز و اقارب کا ماننا ضروری نہیں ہے لیکن رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ماننا مومن کے لئے ضروری ہے جب تک لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا معتقد نہ ہو ہرگز مومن نہیں ہو سکتا تو اگر اس کا رشتہ محبت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹا تو یقیناً ایمان سے خارج ہو گیا کیونکہ تصدیقِ رسالت محبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اسلام میں حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کو سارے عالم سے زیادہ ضروری اور اسلام و ایمان کی شرطِ اول

قرار دیا گیا۔ محبّت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ محبّتِ اجلال واحترام جیسے والدین سے محبت۔ رحمت و شفقت، جیسے اولاد سے محبّت۔ محبّتِ احسان کہ کسی نے آپ پر احسان کیا تو آپ کا دل اس کی طرف مائل ہو گیا۔ تو اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ تمام قسم کی محبّتوں پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہونی چاہیئے۔ کیونکہ مخلوقات میں آپ سے زیادہ شفیق مہربان، فیاض، مُحسن اور محترم ہستی اور کون ہے مطلب حدیث یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان سے جب تک پیارے اور محبوب نہ ہوں اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں والد اور ولد کا ذکر محض اس لیئے لایا گیا ہے کہ یہ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو ان سے لامحالہ محبّت ہوتی ہے چنانچہ ان احادیث کی توثیق و تائید قرآن پاک کی متعدّد آیات سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تمہارے باپ، بیٹے، عورتیں، کنبہ، کمائی کا مال، تجارت، جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہاری پسند کے مکان، یہ چیزیں تمہیں (اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السّلام اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے اور اس مضمون کی متعدّد آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کی محبت آباؤ اجداد، اولاد، عزیز، اقارب، دوست، احباب، مال و دولت، شوکت و حکومت، مسکن و وطن سب چیزوں کی محبّت سے اور خود اپنی جان کی محبّت سے زیادہ ضروری و لازم ہے، اگر ماں، باپ یا اولاد یا رشتہ دار اللہ و رسول کے ساتھ رابطۂ عقیدت و محبّت نہ رکھتے ہوں تو ان سے دوستی و محبّت جائز نہیں۔

معلوم ہوا کہ حضور سے محبّت دین حق کی شرطِ اوّل ہے اور قومِ مُسلم کو حضور سے جو رشتہ ہے وہ دُنیوی قانون کے رشتو [illegible] ہے۔

غزوۂ موتہ

موتہ۔ شام کا ایک مشہور شہر ہے جو کہ بیت المقدس سے دو منزل کے فاصلہ پر کرک کے قریب واقع ہے۔ یہاں جمادی الاولیٰ سنہ ۸ ہجری میں ایک غزوہ ہوا جس کا واقعہ یہ تھا۔

حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل شاہ روم کی طرف ملک شام میں اپنا نامہ اقدس حارث ابن عمیر ازدی کی معرفت روانہ فرمایا۔ جب حضرت حارث نے موتہ کے مقام میں نزول کیا تو شرجیل ابن عمرو غسانی جو قیصر کی طرف سے ملک شام کا امیر تھا آپ کے درپے ہوا اور اس نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں کا قصد رکھتے ہیں۔ فرمایا شام کا!

کہنے لگا شاید آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قاصد ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے آپ کو بندھوا کر قتل کرا دیا اس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قاصد کہیں بھی قتل نہیں کیا گیا تھا جب یہ خبر بارگاہِ رسالت میں پہنچی تو حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت گراں گزری اور آپ نے اپنے اصحاب کا ایک لشکر ترتیب دیا جس کی تعداد تین ہزار تھی اور اس لشکر کو شاہِ روم کے مقابلہ کیلئے روانہ فرمایا۔

حضرت زید ابن حارثہ کو امیرِ لشکر بنایا اور فرمایا کہ اگر زید کام آجائیں تو ان کے بعد جعفر ابن ابی طالب امیر بنائے جائیں۔ وہ بھی کام آجائیں تو عبد اللہ ابن رواحہ۔ وہ بھی کام آجائیں تو مسلمان اپنی جماعت میں سے کسی کا انتخاب کر لیں اور اس کو اپنا امیر بنا لیں۔

اس وقت ایک یہودی وہاں موجود تھا حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے عرض کرنے لگا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو جن لوگوں کے آپ نے نام لئے ہیں یہ سب کام آجائیں گے یعنی شہید

ہو جائیں گے۔ کیونکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے جب کوئی نبی کسی شخص کو قوم پر امیر بنا کر یہ فرما دیتے تھے کہ اگر یہ کام آجائیں تو ضرور وہ کام آتا تھا اور اگر وہ کئی اشخاص کا نام لیتے تو وہ سبھی کام آجاتے۔ پھر وہ یہودی حضرت زید سے کہنے لگا کہ آپ کچھ وصیت کر لیجئے اس لئے کہ اگر سیّدِ عالم، محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم سچے نبی ہیں تو آپ ہرگز واپس نہ آئیں گے۔

حضرت زیدؓ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور پُر نور محبوبِ خدا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچّے نبی ہیں۔ حضور نے ایک سفید جھنڈا تیار کر کے حضرت زید ابن حارثہ کو دیا اور صحابہ کرام کو وصیّت فرمائی کہ وہ حضرت حارث ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قتل گاہ پر پہنچکر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ قبول کریں فبہا ورنہ اللہ کی مدد کے بھروسہ پر ان سے قتال کریں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کو رخصت فرمانے کے لئے ثنیۃ الوداع تک تشریف لائے۔ وہاں ٹھہر کر فرمایا۔ میں تمہیں اور تمہارے ساتھی مسلمانوں کو پرہیزگاری اور حُسنِ عمل کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ کا نام لے کر خدا کے اور اپنے دشمن پر شام میں جہاد کرو۔ وہاں تمہیں کچھ لوگ گوشہ نشین ملیں گے جو عبادت خانوں میں رہتے ہیں ان سے تعرّض نہ کرنا۔ اور کسی عورت اور بچے کو قتل نہ کرنا۔ کوئی درخت نہ کاٹنا۔ کوئی عمارت نہ گرانا۔

اب یہ لشکر ظفر پیکر حضرت سے رخصت ہو کر روانہ ہوا۔ قطعِ منازل و مراحل کرتا ہوا سرزمینِ شام میں پہنچا۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ شاہِ روم دو لاکھ رومی اور پچاس ہزار نصرانی عرب اور بہت سے گھوڑے اور ہتھیار لیکر مقابلہ کیلئے تیار ہے۔ مسلمان تین ہزار تھے وہ بھی بہت بے سر و سامانی کی حالت میں رُومیوں کی طرح نہ ان کے پاس بہت سے گھوڑے اور ہتھیار تھے نہ وافر سامانِ جنگ۔ جب انہیں لشکرِ کفار کی کثرت اور ساز و سامان کی حالت معلوم ہوئی تو وہ اپنی جگہ ٹھہر گئے اور دو شب یہ فکر کرتے رہے کہ کیا دشمن کی تعداد کی خبر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجیں اور حضور سے پھر دوبارہ اجازت حاصل کریں ممکن ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کوئی مزید کمک بھیجیں یا اور کوئی حکم فرمائیں۔ لوگ اس خیال میں تھے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "اے قوم جس چیز میں تم تردّد کر رہے ہو یہ وہی ہے جس کی تلاش میں تم نکلے تھے۔ تمہارا مطلوب شہادت ہے اور ہم عدو قوّت اور کثرت کے بھروسہ پر جنگ نہیں کرتے۔ ہماری قوتِ جنگ ہمارا دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ ہمیں ایک کامیابی ضرور حاصل ہوگی یا دشمن پر غلبہ یا راہِ خدا میں شہادت۔ ——— یہ تقریر دلوں میں اثر کر گئی۔

صحابہ نے فرمایا اے ابنِ رواحہ تم سچے ہو اور یہ لشکر ظفر پیکر جنگ کیلئے روانہ ہوگیا۔ ہرقل بادشاہِ روم کی افواج انہیں ملیں اور مسلمان موتہ کے قریب مجتمع ہوئے جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت زید ابن حارثہ نے جہاد شروع کر دیا۔ آپ کے دستِ مبارک میں حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رایت ظفر آیت تھا وہ لئے ہوئے جنگ کرتے رہے اور اسی جنگ میں شہید ہوگئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے ہاتھ سے عَلم لیا اور مصروفِ قتال ہوئے۔ اوّل اوّل آپ گھوڑے پر قتال فرماتے رہے۔ پھر گھوڑے سے اتر کر اس کی کوچیں کاٹ دیں یہ اس اندیشہ سے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ گھوڑا کفار کے ہاتھ آئے اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس سے جنگی کام لیں۔ اب آپ نے پیادہ ہو کر قتال شروع کیا۔ اس وقت جنگی مصلحت اسی کی متقاضی تھی۔ آپ سرگرمِ قتال رہے یہاں تک کہ داہنا دستِ مبارک قطع ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و بسالت داہنا ہاتھ جو جنگ میں کام کرنے والا ہے اس کے قطع ہو جانے کے بعد جرأت و ہمت کا یہ عالم ہے کہ عَلم بائیں دست مبارک میں لے لیا اور اس سے قتال شروع کیا یہاں تک کہ بایاں دستِ مبارک بھی علیحدہ ہوگیا۔ پھر بھی آپ لڑائی میں شامل رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے عَلم ان کے ہاتھ سے لیا اور اپنے گھوڑے پر آگے بڑھے اور کچھ غور کرنے کے بعد آپ بھی گھوڑے سے اتر کر پیادہ پا مصروفِ جنگ ہوئے اور اپنی ہمّت و قوّت کے جوہر دکھا کر شہید ہوگئے۔ اب گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی اور عَلم ثابت بن اقرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

اپنے دستِ مبارک میں لیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ اب تم اپنے اتّفاق سے کسی شخص کو سردار مقرر کر لو۔

مسلمانوں نے کہا کہ آپ ہی سردار ہیں آپ نے اس میں عذر کیا اور فرمایا کہ حضرت خالد جنگ کے مجھ سے زیادہ ماہر ہیں۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپ زیادہ حقدار ہیں کیوں کہ آپ بدر میں حاضر ہوئے ہیں۔ آخر کار مسلمانوں کے اتفاق سے حضرت خالد نے ان سے علم لیا اور میدانِ جنگ کا نقشہ بدلا۔ مقدمۂ جیش کو ساقہ بنایا اور میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ،

اس نظم سے مشرکین گھبرا گئے اور ان پر رعب چھا گیا پہلے ہی حملہ میں بھاگ نکلے اور بکثرت قتل کئے گئے اور بہت بدحالی کے ساتھ انہیں ہزیمت ہوئی۔ مسلمانوں کی تلواریں خونِ کفّار سے خوب سیراب ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تھوڑی تعداد کو لاکھوں کافروں پر غالب فرمایا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں اس دن نو تلواریں ختم ہو گئیں اتنا قتال فرمایا کہ ایک تلوار از کار رفتہ ہو جاتی تھی تو دوسری تلوار ہاتھ میں لیتے تھے۔ صحیفہ یمانیہ دسویں تلوار تھی جو آپ کے دستِ مبارک میں باقی رہی۔

یہاں تو جنگ کا یہ نقشہ رہا، اب مدینہ طیبہ میں دیکھئے وہاں کیا ہو رہا ہے۔

حضور سیّدِ انبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وسلم نے اعلان فرمایا۔ لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا، مسجد شریف میں مسلمانوں کا مجمع ہے۔ سیّدِ انبیا حبیبِ کبریا محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم منبرِ اقدس پر تشریف فرما ہوئے۔ چشمِ مبارک اشکوں سے گوہر باری فرما رہی ہیں اور چہرۂ انور پر آنسو ڈھلک ڈھلک کر آ رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا:-

حاضرین! میں تمہیں تمہارے مجاہد لشکر کی خبر دوں وہ یہاں سے روانہ ہوئے۔ دشمن کے مقابل پہنچے۔ جنگ جاری ہوئی۔ پہلے حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے ان کے لئے استغفار کرو۔ سب نے ان کے لئے استغفار کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ میت کے لئے ایصالِ ثواب و دعائے مغفرت سنّت ہے۔ فاتحہ وغیرہ معمولاتِ اہلِ سنّت کی یہ حدیث اصل و مثبت ہے۔

پھر علم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دستِ مبارک میں لیا اور سخت حملہ کر کے کفار کو پریشان کر دیا۔ آخر کار وہ بھی شہید ہو گئے۔

یہ سن کر پھر مجمعِ صحابہ نے حضرت جعفر کے لئے دعائے مغفرت کی۔ ان کے بعد علم حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لیا اور جانبازانہ سرگرمیوں کے بعد وہ بھی شہید ہو گئے۔

یہ سن کر جماعت نے ان کے لئے بھی دعائے مغفرت کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسکے بعد حضرت خالد ابن ولید نے جھنڈا لیا وہ سیف اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر فتح دی۔ اسی دن سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لقب **سیف اللہ** ہوا۔

اسماء بنت عمیس حضرت جعفر طیار کی بی بی ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضرت جعفر کی شہادت کے دن حضور پُرنور سیّدِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مع اپنے اصحاب کے میرے یہاں تشریف لائے اور مجھے حکم دیا کہ میں حضرت جعفر کے فرزندوں کو حاضر کروں۔ میں نے انہیں حاضر کیا۔ حضور نے انہیں پیار فرمایا اور چشم مبارک اس قدر اشکبار ہوئیں کہ ریشِ اقدس تر ہو گئی۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا۔ کیا حضور کو حضرت جعفر اور ان کے ہمراہیوں کی کوئی خبر پہنچی۔؟

فرمایا! ہاں۔ آج وہ کام آگئے۔

سبحان اللہ مدینہ طیّبہ میں تشریف فرما ہیں اور منزلوں فاصلہ پر لشکر کو جو واقعات پیش آ رہے ہیں وہ نظرِ انور کے سامنے ہیں۔ پھر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو آلِ جعفر کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے وہ کھانا کھایا اور مجھے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز تک اپنے پاس رکھا۔

یہ کھانا جو آلِ جعفر کے لئے تیار کیا گیا یہ ہی طعامِ تعزیت کی اصل ہے۔

عرصہ کے بعد لشکر سے حضور کی خدمت میں خبر دینے کے لئے صحابی آئے ۔ حضورِ اکرم نے ان سے منع فرمایا کہ اگر تم چاہو تو تم ہی خبر سنا دو اور اگر چاہو تو میں تمہیں خبر سنا دوں ۔

انہوں نے عرض کیا کہ حضور ہی بیان فرمائیں ۔

حضور علیہ السلام نے معرکۂ جنگ کی تمام و کمال خبر سنائی اور کل حالات بیان فرما دیئے ۔ سبحان اللہ یہ ہے حضور علیہ السلام کے علمِ وسیع کا ایک نمونہ ۔

یہ واقعہ تو اس زمانہ اقدس کا ہے جس پر پونے چودہ سو برس سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا ۔ لیکن قدرت نے دنیا کے لئے پھر وہ منظر سامنے کیا جس پر وہ اعتبار خالص کر سکے ۱۳۵۲ھ میں فلسطین کے جرائد نے لکھا تھا جس کو اخبار سیاست لاہور نے شائع کیا اور اخباری دنیا میں اس عجیب و غریب واقعہ کا بہت شہرہ ہوا ۔

واقعہ یہ ہے کہ مقام کرک کے نواح میں ایک قریہ ہے جسے مسجد سیدی جعفر طیار کہتے ہیں ۔ اس مسجد کے متّصل ایک سرائے ہے ۔ اس سرائے میں مزدور کھدائی کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک سرنگ نظر آئی ۔ کچھ اور کھدائی کی گئی تو ایک بڑا کمرہ نکل آیا جس کی چھت اینٹوں سے مضبوط چنی ہوئی تھی اور اس کمرہ میں ایک سو نعشیں رکھی ہوئی تھیں ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نعشیں ان صحابہ کرام کی ہیں جو غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہید کئے گئے تھے ۔

یہ قیاس اس لئے قرینِ قیاس ہے کہ موتہ کی مشہور لڑائی اسی جگہ ہوئی تھی ۔ تمام نعشوں کے سر پہ عمامے ہیں ۔ بعض کفن بھی پہنے ہوئے ہیں بعض معمولی لباس میں ہیں ۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن کے زخم ہنوز ہرے معلوم ہوتے ہیں ۔ (ریاست لاہور ۲۴ مارچ ۱۹۳۳ء)

زمانۂ حال کا یہ انکشاف ظاہر بینوں کو شہدا کی حیات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے ۔ اس کے علاوہ صدہا واقعات دنیا میں روزانہ ایسے پیش ہو جاتے ہیں جو اس حیات کی شہادت دینے کے لئے معتبر و معتمد گواہ ہیں ۔

توبہ

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

(ترجمہ) "اے ایمان والو! تم اللہ کی طرف خاص توجہ کرو وہ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تمہاری خطائیں بخشے گا اور اللہ نہایت بخشش والا مہربان ہے" ۔

اس آیت میں ایمانداروں کو توبہ کا حکم ہو رہا ہے اور توبہ بھی کیسی؟ جو خالص اور سچی ہو۔ اس حکم کی تعمیل میں ہر ایماندار کو توبہ کرنی لازم ہے۔ جتنی دفعہ گناہ ہو اتنی دفعہ توبہ کرنی واجب ہے یا جتنے گناہ ہیں ہر ایک سے توبہ کرنی واجب ہے۔ سچی اور خالص توبہ اس طرح ہوتی ہے کہ گناہ پر دل سے نادم ہو اور زبان سے استغفار کرے اور اپنے اعضاء سے اس کی ترک کرے اور عزم کرے کہ وہ پھر یہ کام نہیں کرے گا۔ اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے حد پریشان اور بے قرار ہوتا ہے اور خدا کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ جب کوئی بندہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا وہ گناہ کراماً کاتبین اور اس کے اعضاء جوارح اور زمین کے ان ٹکڑوں کو جن پر اس نے گناہ کیا تھا، بھلا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضر ہوگا تو اس کے گناہ پر اللہ کی طرف سے کوئی گواہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ کھولتا ہے کہ وہ دن کے گنہگار کی توبہ قبول کرے اور اس کے گناہ کو بخشے۔ اور دن کو اپنا ہاتھ کھولتا ہے کہ وہ رات کے گنہ گار کی توبہ قبول کرے اور اس کے گناہ معاف کرے۔

اللہ تعالیٰ کو گنہگار ایماندار سے جو توبہ کرے بڑی محبت ہے۔ جب بندہ اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرنے میں توقف نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ بدستور اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا رہتا ہے جب تک وہ غرغرہ نہ کرے یا توبہ کا دروازہ جو مغرب کی جانب ہے بند نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے سے ایک ہزار سال پہلے عرش پر لکھ رہا تھا۔

اِنِّیْ غَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ ۝ "میں جو توبہ کرے گا اس کو بخش دوں گا۔"

توبہ کا دروازہ جو مغرب کی جانب ہے اس کے دروازے کی چوڑائی ۷۰ سال کی مسافت کے برابر ہے جب وہ بند ہو جائے گا تو کسی شخص کا ایمان اور کسی شخص کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک گنہ گار تھا جو اپنے رب کو کہہ رہا تھا۔ اے میرے رب میرے گناہ کو بخش!

فرشتوں نے اس کی آواز کو روک لیا۔ اس نے پھر اسی طرح حزین و غمناک آواز میں اپنے رب کو پکارا اور کہا۔ اے میرے رب میرا گناہ بخش۔

فرشتوں نے پھر اس کی آواز کو روکا۔ اس نے پھر تیسری دفعہ نہایت گریہ اور آہ و زاری سے اپنے رب کے آگے فریاد کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ۔ "تم کب تک میرے اور میرے بندے کے درمیان حائل ہوتے رہو گے تم سب گواہ رہو کہ میں نے اس کو بخش دیا۔"

جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو اس کی حالت بدل جاتی ہے اور سچی توبہ کی علامت بھی یہی ہے۔

ایک شخص اپنی توبہ کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ:

"میں جنگل میں رہتا تھا اور ڈاکہ زنی میرا پیشہ تھا اور میرے ماتحت اور بھی کئی آدمی کام کرتے تھے

ایک دن میں نے ایک جگہ کھجور کے دو درخت دیکھے۔ ایک ہرا اور دوسرا خشک تھا۔ ایک پرندہ ہرے درخت سے منہ میں کچھ لے کر خشک درخت کی طرف بار بار جاتا تھا۔ میں اس پر حیران ہوا۔ اس کو معلوم کرنے کے واسطے میں خشک درخت پر چڑھا۔ وہاں میں نے ایک اندھے سانپ کو دیکھا۔ وہ پرندہ اس کو اس کی خوراک بہم پہنچا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ اے اللہ تو نے اِس اَندھے سانپ کی خوراک کا انتظام کیا ہے اور مجھ کو کئی سالوں سے روزی کے واسطے ایسے کام میں لگایا ہوا ہے جو بہت بُرا ہے۔ آواز آئی ہمارا دروازہ ہر ایک کے واسطے کھلا ہے۔

جب میں نے یہ آواز سنی تو میری زبان پر توبہ توبہ کا لفظ جاری ہو گیا اور میں اپنے فعل پر بڑا نادم اور پشیمان ہوا۔ میرے سارے دوست میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے تیری حالت کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا۔ میں نے سچی توبہ کی ہے۔ اب مجھے اپنے فعل سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام۔

میری توبہ سے ان کے قلوب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان سب نے بھی توبہ کی اور پھر ہم نے اپنے کپڑوں کو اتار دیا کیونکہ وہ حرام ذریعہ سے حاصل کئے گئے تھے اور ہم سب کے سب بیت اللہ شریف کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک بستی کے قریب ایک بڑھیا ملی۔ اس کے پاس کپڑوں کی گٹھڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو وہ ہمارے قریب آئی اور اس نے میرا نام لیکر پوچھا کہ کیا فلاں نام کا شخص تم میں ہے۔ میں نے کہا وہ تو میں ہی ہوں تم نے مجھے کیا کہنا ہے۔

اُس نے کہا۔ میرا ایک لڑکا تھا جو جہاد میں شہید ہو گیا ہے اور میں چاہتی تھی کہ اس کے کپڑے کسی کو دے دوں۔ غیب سے آواز آئی کہ فلاں شخص آرہا ہے اپنے بیٹے کے کپڑے اس کو دے دے۔ اس واسطے تمہارے انتظار میں میں یہ کپڑے لے کر بیٹھی ہوئی ہوں۔

ہم نے اس بڑھیا سے وہ کپڑے لئے اور پہنے اور بیت اللہ شریف کو چلے گئے ۔"

دیکھا توبہ سے کتنی حالت بدل گئی پہلے وہ ڈاکو تھا۔ آتے جاتے قافلے کو لُوٹنا، قتل کرنا ظلم کرنا اس کا ذریعہ معاش تھا اور جب اس نے توبہ کی کہ وہ ایک متقی پارسا اور دیندار شخص بن گیا کہ اس کو اس جگہ سے نفرت ہو گئی جہاں وہ قافلوں کو لوٹا کرتا تھا اور اس لباس کو اس نے اپنے اوپر پسند نہیں کیا جو حلال وطیّب طریقہ سے نہیں حاصل کیا گیا تھا۔

* * *

شوہر کے حقوق

قیامت کے دن سب سے زیادہ پوچھ بندوں کے اپنے حقوق کی ہوگی جو ایک دوسرے پر ہیں۔

درحقیقت بنی آدم کے یہ حقوق ہی نظامِ کائنات کی اصلاح کا موجب ہیں اور ان کی رعایت عدل و انصاف، امن وامان، خیرِ وعافیت کا باعث ہے۔ اگر لوگ اپنے حقوق کو اور ان ذمہ داریوں کو پہچانیں جن کی حفاظت بہت ضروری ہے تو نظام دنیا میں کوئی خلل اور کوئی فساد رونما نہ ہو بلکہ دنیا ہر کہہ ومہ امیرِ وغریب۔ راعی و رعایا کے واسطے جنت اور امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔

یہاں ہم اپنی بہنوں کے واسطے شوہر کے حقوق بیان کریں گے۔ عقلمند‘ دانا‘ عورت وہ ہے جو ایک مرد کے زیرِ سایہ آجانے کے بعد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو جانے اور جو اس کے شوہر کے حقوق پروردگارِ عالم نے اس کو سونپے ہیں ان کو معلوم کر کے ان کے ادا کرنے میں غفلت نہ کرے۔

قُرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔"

اس سے ثابت ہوا کہ عورتیں محکوم ہیں یعنی مردوں کی اطاعت و فرمانبرداری کرنی اور ان کا حکم ماننا بشرطیکہ شرع کے خلاف نہ ہو فرض ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا ہے جب تک عورت اپنے خاوند کا حق ادا نہ کرے تب تک وہ اللہ کا حق بھی ادا نہیں کر سکتی۔

تو جو عورت اپنے خاوند کی نافرمان ہو اور اس کو اپنے اوپر راضی رکھنے کی کوشش نہ کرے اور اس کے حکم کو ٹال دے وہ اگرچہ کتنی نیکوکار تہجد گزار ہو۔ کتنا صدقہ خیرات کرے اللہ اس کو قبول نہیں کرتا اِس واسطے کہ عورت کے واسطے نیکی کی اصل شوہر کی اطاعت اور اسکی خوشنودی ہے،

ایک عورت نے اپنی بیٹی کو جب اس نے اس کا ایک مرد سے نکاح کیا تو کیسی اچھی نصیحت کی کہ :۔

"بیٹی! جس گھر میں تو پیدا ہوئی تھی تُو اب اُس سے نکل گئی ہے اور تو ایک ایسے بچھونے کی طرف پھیر دی گئی ہے جس کو تو نے دیکھا نہیں ہے اور تو ایک ایسے اجنبی مرد کی رفیق بنا دی گئی ہے جس سے تو واقف نہیں۔ پس تو اس کے واسطے زمین بن جا تاکہ وہ تیرے واسطے آسمان بنے۔ تُو اُس کے واسطے بچھونا بن کہ وہ تیرے واسطے ستون بنے۔ تُو اسکے واسطے لونڈی بن کہ وہ تیرے واسطے غلام بنے۔ ہر وقت اس کے ساتھ نہ لگی رہے تاکہ وہ تجھ سے نفرت نہ کرے اور اس سے اس قدر دور بھی نہ رہ کہ وہ تجھ کو بالکل بھلا دے۔ اگر وہ تیرے قریب ہو تو تُو بھی اس کے قریب ہو اور اگر وہ تجھ سے پرے ہٹے تو تُو بھی پرے ہٹ۔ تُو اپنے ناک، کان اور آنکھ کی حفاظت کر کہ جب وہ تجھ سے سونگھے تو خوشبو سونگھے اور جب دیکھے تو خوبصورتی کو دیکھے اور سنے تو نیک بات کو سنے۔"

ابن حبان نے اپنی صحیح میں یہ حدیث لکھی ہے کہ :۔ "ایک شخص اپنی بیٹی کو لیکر نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

کی خدمت میں آیا اور عرض کی میری یہ بیٹی نکاح کرنے سے انکار کرتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی سے فرمایا اپنے ماں باپ کا حکم مان۔ اس نے کہا۔ قسم ہے مجھ کو اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ شوہر کے بیوی پر کیا حقوق ہیں میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔

آپ نے فرمایا شوہر کا حق بیوی پر اتنا بڑا ہے کہ اگر شوہر کے جسم پر زخم ہو یا اس کی ناک سے پیپ اور خون بہہ رہا ہو اور بیوی اس کو اپنی زبان سے چاٹ کر نگل جائے تو پھر بھی اس سے شوہر کا حق ادا نہ ہو۔

یہ تمثیل بطورِ مبالغہ کے شوہر کے حقوق کی عظمت کو اس عورت کے ذہن میں بٹھانے کے واسطے ہے ورنہ اس سے حقیقتاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جب مرد کی ایسی حالت ہو تو عورت اس کو زبان سے چاٹے اور جو اس کو حاصل ہو اس کو نگل جائے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے جب عورت پانچ وقت کی نماز ادا کرے اور فرج کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو قیامت کے دن اسکو حکم ہوگا کہ جنت میں تو جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا۔

اور ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے مردوں کو سجدہ کریں۔

طبرانی میں ہے کہ شوہر کے حقوق میں سے جو عورتوں پر ہیں یہ ہیں :-

(١) جب وہ اسے اپنی حاجت کیلئے بلائے تو اسکو اس سے منع نہ کرے اگرچہ وہ گھوڑے کی پالان پر ہی کیوں نہ سوار ہو۔

(٢) نفل روزہ نہ رکھے مگر شوہر کی اجازت کے ساتھ اگر اسنے اجازت کے بغیر روزہ رکھا تو اللہ اسکو قبول نہیں کرے گا۔

(٣) شوہر کے گھر سے باہر نہ نکلے مگر اس کی اجازت کے ساتھ۔ اگر وہ بلا اجازت اسکے گھر سے باہر نکلی تو جبتک وہ واپس نہیں آتی آسمان کے فرشتے زمین کے فرشتے، رحمت کے فرشتے۔ عذاب کے فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اگر مرد اپنی حاجت کے واسطے عورت کو بلائے تو وہ اس کے پاس آئے اگرچہ تنور میں روٹیاں لگا رہی ہو ∴

دُعا ـــــ اور ـــــ اُس کے آداب

فضائلِ دُعا ـــــ قُرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے ،

اور فرماتا ہے :۔

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ؛ "مجھ سے دعا مانگو میں قبول فرماؤں گا"۔

تیسری جگہ فرماتا ہے :۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ جو لوگ میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں عنقریب
سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۝ جہنّم میں جائیں گے ۔ ذلیل ہو کر۔

یہاں عبادت سے مراد دُعا ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللہ عزّوجل ارشاد فرماتا ہے میں اپنے بندے ۔۔۔۔۔۔ کے گمان کے پاس ہوں یعنی جیسا وہ مجھ سے گمان رکھتا ہے میں ایسا ہی کرتا ہوں وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا دَعَانِیْ اور میں اس کے ساتھ ہوں جب مجھ سے دعا کرے۔

۲۔ حدیث شریف ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ سے نقل فرماتے ہیں : اے فرزندِ آدم تو جب تک مجھ سے دعا کرتا اور میرا امیدوار رہے گا میں تیرے گناہ کیسے ہی ہوں معاف فرماتا ہوں گا"

۳۔ حدیث : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :۔ دُعا مسلمانوں کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نُور۔

۴۔ **حدیث:** رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ بلا اُترتی ہے پھر دُعا اُس سے جا ملتی ہے تو دونو کشتی لڑتی رہتی ہیں قیامت تک یعنی دعا اِس بلا کو اترنے نہیں دیتی۔

۵۔ **حدیث:** آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر غضب فرمائے۔

۶۔ **حدیثِ قدسی:** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو مجھ سے دعا نہ مانگے میں اس پر غضب فرماؤں گا۔ وَالعیاذ باللہ تعالیٰ

آدابِ دُعا جس قدر ہیں سب اسبابِ اجابت ہیں۔ انشاء اللہ العزیز ان کا اجتماع مورثِ اجابت ہوتا ہے بلکہ بعض مثلاً حضورِ قلب اور اپنے آقا و مولے پر درود و سلام۔

(۱) دل کو حتی الامکان خیالاتِ غیر سے پاک کرے کیونکہ اللہ عزوجل کا خاص محلِ نظر دل ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَایَنظُرُ اِلیٰ صُوَرِکُمْ وَاَبْدَانِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلیٰ قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ۔

(۲)(۳)(۴)۔ بدن و لباس و مکان طاہر و پاک و لطیف ہوں کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکی کو دوست رکھتا ہے

(۵) جن کے حقوق اس کے ذمے ہوں ادا کرے یا ان سے معاف کرائے۔ خلقِ خدا کے حقوق غصب کرکے دعا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اس حالت میں بادشاہ کے حضور بھیک مانگنے جائے کہ لوگ اسے چاروں طرف سے چمٹے ہوئے ہوں اور داد فریاد کرتے ہوں کہ مجھے گالی دی۔ مجھے مارا پیٹا۔ مجھ سے میرا حق چھینا۔ غور کرے کہ اس کا یہ حال قابلِ عطا و نوال ہے یا لائقِ سزا و نکال۔

(۶) کھانے پینے۔ لباس و کسب میں حرام سے اجتناب کرے کہ حرام خور اور حرام کار کی دعا اکثر رد ہوتی ہے۔

(۷) دعا سے پہلے گذشتہ تمام گناہوں سے توبہ کرے اور آئندہ نیک چلنے کا عہد کرے کہ نافرمانی پر قائم رہ کر عطا مانگنا بے حیائی ہے۔

(۸)(۹)(۱۰)(۱۱)۔ بوقتِ دُعا باوضو۔ قبلہ رُو مؤدب دوزانو بیٹھ کر یا گھٹنوں کے بل کھڑا ہو۔ بہ نیتِ شکر توفیقِ دعا

والتجا الی اللہ سجدہ کرے کہ یہ صورت سب سے زیادہ قُربِ ربّ کی ہے۔

(۱۱) دل میں خشوع و خضوع ہو اور نگاہ نیچے رکھے۔

(۱۲) اول و آخر حمدِ الٰہی بجا لائے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی اپنی حمد کو دوست رکھنے والا نہیں۔ تھوڑی حمد پر بہت راضی ہوتا ہے اور بے شمار عطا فرماتا ہے حمد کا مختصر و جامع کلمہ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اِلَّا كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ اور اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا نَقُوْلُ وَخَیْرًا مِّمَّا نَقُوْلُ ہے۔ یوں ہی اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا یُّوَافِیْ نِعَمَكَ وَیُكَافِیْ مَزِیْدَ كَرَمِكَ۔ یہ سب احادیث میں وارد ہیں۔

(۱۳) اوّل و آخر اپنے آقا و مولا اور ان کے آل و اصحاب پر درود کا تحفہ بھیجے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے اور پروردگارِ عالم اس سے بالا و بالاتر ہے کہ اوّل و آخر کو قبول فرما کر وسط کو رد کر دے امیر المومنین فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ دعا زمین و آسمان کے درمیان رکی جاتی ہے جب تک تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام نہ بھیجے بلند نہیں ہونے پاتی گویا کہ دعا طائر ہے اور درود و سلام اس کے پَر کہ اس کے بغیر اڑ نہیں سکتی۔

(۱۴) اب کہ دعا مانگنے کا وقت آیا۔ تصوّرِ عظمتِ جلالِ الٰہی میں ڈوب جائے اگر اس مبارک تصوّر نے وہ غلبہ کیا کہ زبان بند ہو گئی۔ تو سبحان اللہ یہ خاموشی ہزار عرض سے زیادہ کام دے گی ورنہ اس قدر تو ضرور ہو گا کہ حیا و ادب و خضوع و خشوع ہو گا کہ یہی روحِ دعا ہے کہ اس کے بغیر دعا تنِ بے جان ہے اور تنِ بے جان سے امّید حماقت و جہالت۔

(۱۵) شروع میں اللہ عزّوجل کو اس کے محبوب ناموں سے پکارے۔ آقا و مولیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے کہ جو شخص تین بار کہتا ہے فرشتہ کہتا ہے کہ مانگ ارحم الراحمین تیری طرف متوجہ ہوا۔ پانچ بار یَا رَبَّنَا کہنا بھی نہایت مؤثر اور موجبِ قبولیّت ہے۔

(۱۶) اللہ تعالیٰ کے اسماءِ صفات اور اس کی کتابوں ملائکہ اور انبیاءِ کرام خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نیز اس کے اولیاء و اصفیاء بالتخصیص حضور غوثِ اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے توسّل سے مانگے کہ محبوبانِ خدا کے وسیلے سے دعا قبول ہوتی ہے۔

(۱۷) بکمالِ ادب ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر سینے یا شانوں یا چہرے کے بالمقابل لائے۔ یہاں تک کہ بغل کی سپیدی ظاہر ہو اور ہتھیلیاں پھیلا رکھے۔

(۱۸) نہایت نرم و پست الفاظ میں دعا کرے اور بار بار تکرار کرے کیونکہ تکرارِ سوال۔ صدقِ طلب پر دلیل ہے اور طاق مرتبہ ہو۔

(۱۹) آنسو ٹپکانے میں کوشش کرے اگرچہ ایک ہی قطرہ ہو کہ دلیلِ اجابت ہے۔ رونا نہ آئے تو رونے جیسا منہ بنالے۔

(۲۰) دُعا میں تمام مسلمان مردوں۔ عورتوں۔ حاضر و غائب۔ زندہ و مردہ کو شریک کرے۔ خصوصاً والدین جسمانی و روحانی کو جو موجبِ حیات ظاہری و باطنی ہیں۔

فوائدِ دُعا

اوّل عابدوں کے گروہ میں داخل ہوتا ہے کہ دعا فی نفسہٖ عبادت بلکہ سرِ عبادت۔

دوم اپنے عجز و احتیاج کا اقرار اور مولیٰ کے کرم و قدرت کا اعتراف کرنا ہے

سوم۔ حُکمِ شرع پر عمل کہ نہ مانگنے پر غضبِ الہٰی کی وعید آئی ہے۔

چہارم۔ اتباعِ سنّت ہے کہ حضورِ اقدس اکثر دعا مانگتے اور دوسروں کو بھی تاکید فرماتے۔

پنجم: دفعِ بلا و حصولِ مدعا کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ " آدمی جب مانگتا ہے تو میں دیتا ہوں" حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ دعا بندے کی تین باتوں سے خالی نہیں۔ یا اس کا گناہ بخشا جاتا ہے یا دنیا میں اسے فائدہ حاصل ہوتا ہے یا اس کیلئے آخرت میں بھلائی جمع کی جاتی ہے

کہ جب بندہ اپنے اس ثواب کو دیکھے گا جو دعا قبول نہ ہونے کی بنا پر اس کے لئے جمع ہوا تو وہ تمنا کرے گا کاش دنیا میں میری کوئی دعا قبول نہ ہوتی۔ بہر حال دعا میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فِسق کا نتیجہ

اتباعِ شریعت سے عملاً خارج ہونے کا نام فسق ہے فِسق سے قلبِ انسانی آہستہ آہستہ سیاہ ہوتا رہتا ہے گناہوں کے آثار قلب کی نورانیت کو مضمحل کر دیتے ہیں اور جب دل ہی فاسد ہوگیا تو سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے

سن لو اقلیمِ بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو سارا بدن درست ہوجائیگا اور اگر وہ خراب ہوجائے تو سارا بدن خراب ہوجائے گا۔ اور وہ دل ہے۔ (بخاری)

جب دل کو گناہوں کی سیاہی سیاہ کر دیتی ہے تو ایمان کے شرارے سرد پڑجاتے ہیں اور عقائدِ باطلہ کو دل میں نفوذ کرنے کو آسانی ہوجاتی ہے اور اس طرح باطل آتا ہے اور انسان کے اندر سرایت کر کے جم جاتا ہے اور آدمی گمراہ و بے دین ہوجاتا ہے۔

پھر اگر رحمتِ الٰہی سایہ فگن ہو تو وہ ہی اپنے فضل سے توبہ کی توفیق عطا فرماتا ہے اور توبہ کرنے والے اور اپنے اعمالِ فاسدہ وعقائدِ باطلہ سے رجوع کرنے والوں سے اپنی محبت کا اعلان فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

اسلام

میں

قتلِ عمد کی سزا اور اُس کے احکامات

کیا قتل جیسا سنگین جُرم بھی قابلِ راضی نامہ ہے؟

قسمِ اوّل قتلِ عمد اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی دھاردار آلہ سے قصداً عمداً قتل کرنا آگ میں جلادینا گولی چھرے اور دھاردار پتھر لکڑی بالنس کی کھپچی سے قتل کرنا یہ سب قتلِ عمد کی صورتیں ہیں اسی طرح لوہے پیتل وغیرہ کی اشیاء سے قتل کرنا جب کہ اس سے زخم آئے قتلِ عمد میں داخل ہے جیسے چھُری، خنجر، نیزہ، بم کلہاڑی وغیرہ سے قتل کرنا۔

قتلِ عمد کی اخروی سزا ایک مومن مسلمان کو ناحق قصداً عمداً قتل کر دینا کفر کے بعد تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، قرآن مجید نے فرمایا:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۔ (النساء)

(ترجمہ) جو کسی مومن مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

یہ آیت اُخروی سزا سے متعلّق ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کو قصداً عمداً قتل کرنا سخت اور اشد کبیرہ گناہ ہے، حدیث میں ہے کہ دنیا کا ہلاک ہونا اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل سے ہلکا ہے، مسلمان کے قاتل کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں اس میں صحابہ کا بھی اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ قاتل کی توبہ قبول

ہوسکتی ہے اوراس کی مغفرت کی امید بھی باندھی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ صدقِ دل کے ساتھ نادم ہو اور توبہ کرے۔ قرآن فرماتا ہے:۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ (ترجمہ) اللہ مشرک کو نہیں بخشے گا لیکن اس سے نیچے بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰالِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ نیچے جتنے بھی گناہ ہیں چاہے تو انکی مغفرت فرما دے۔

آیتِ مذکورہ میں لفظ خلود آیا ہے یہاں خلود کے معنی مدّت دراز کیلئے جائیں گے کیونکہ جب خلود کے لفظ سے مدتِ طویل مراد ہوتی ہے۔ تو قرآن میں اس کے ساتھ لفظ ابد مذکور نہیں ہوتا لہٰذا جب خلود کے معنیٰ مدتِ دراز کے ہوئے تو سزا اُخروی اس شخص کیلئے ہوگی جس نے محض عداوت کی بنا پر ایک مسلمان کو قتل کردیا اور اگر اس نے مسلمان کے قتل کو حلال سمجھا تو یہ کفر ہے ایسی صورت میں اگر بغیر توبہ کے مرا تو ابدی طور پر کفّار کی طرح جہنّم میں رہے گا۔ واضح ہو کہ کفار کیلئے خلود بمعنی دوام آیا ہے اور قرآن نے اس کے ساتھ ابد کی قید بھی لگائی ہے۔

شانِ نزول اس آیت پاک کا شان نزول یعنی وہ حادثہ اور واقعہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی یہ ہے۔ عقیس بن کے بھائی قبیلہ بنی نجّار میں مقتول پائے گئے اور قاتلوں کا سراغ نہ لگا۔ بنی نجار نے بحکم رسول دیت ادا کردی لیکن عقیش نے اپنے بھائی کے بدلے میں ایک بغیر قاتل مسلمان کو بے خبری میں قتل کردیا اور دیت کے اونٹ لیکر مکہ بھاگ گیا اور مُرتد ہوگیا عقیس اسلام میں پہلا شخص ہے۔ جو مرتد ہوا۔ اس پر یہ آیہ مُبارک نازل ہوئی جس میں مومن اور مسلمان کے قتل کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا۔

قتلِ عمد کی دُنیاوی سزا قتلِ عمد کی دُنیاوی سزا صرف قصاص ہے قرآن مجید نے فرمایا:۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی (ترجمہ) تم پر قتل کے مقدموں میں قصاص فرض کیا گیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے یہ آیتِ کریمہ ظہورِ اسلام سے پہلے جو قبائلی نظام رائج تھا اس کی تردید کیلئے نازل ہوئی۔ قبائلی نظام یہ تھا کہ وہ ایک کے بدلے کئی اشخاص کو قتل کرتے تھے۔ قاتل اگر عورت ہو تو اس کے عوض مرد کو قتل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح غلام کے بدلے آزاد سے انتقام لیتے تھے۔ اسلام آیا تو اس

نے اس ظالمانہ نظام کو ختم کر دیا اور حکم دیا کہ مقتول کے بدلہ قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے گی قطع نظر اس کے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کس مرتبہ کا ہے۔

قتل کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے ایک یہ رعایت بھی دی (اور یہ رعایت و تخفیف بھی اسی خدا نے دی ہے جس نے قصاص کا حکم دیا ہے۔ اب کسی زمانہ یا ماحول میں ترمیم کرنا یا اس کو ناقابلِ عمل ٹھہرانا اللہ کے حکم کو منسوخ کرنا اور اس کے منشا کے خلاف ہے) چنانچہ ارشاد ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ   جس کیلئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہو تو
بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔   بھلائی سے تقاضا کرے اور اچھی طرح سے ادا کرے۔

اس آیت میں قتل تک کے معاملہ کو قابلِ راضی نامہ قرار دیا گیا ہے یعنی مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کر دیں اور اس صورت میں عدالت کو جائز نہیں کہ قاتل کی جان لینے ہی پر اصرار کرے۔

معافی کا قانون اللہ کی رحمت ہے پھر قرآن نے معافی کے قانون کو اللہ کی خاص رحمت اور تخفیف قرار دیا ہے اب کتنے بڑے ظالم ہیں وہ لوگ جو خدا کی اس تخفیف اور رحمت کو ناقابلِ عمل قرار دیتے ہیں اور قاتل کو معاف کر دینے پر طرح طرح کے فرضی اعتراضات پیدا کر کے اللہ کی مرضی اور منشا کے خلاف قدم اٹھا رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ   یہ معافی کا قانون تمہارے رب کی طرف سے خاص رحمت اور تخفیف ہے۔

ناجائز دباؤ ڈال کر معافی حاصل کرنا معافی کی صورت میں ایک خرابی پیدا ہو سکتی تھی کہ قاتل اگر سرمایہ دار اور معزز شخص ہے تو مقتول کے ورثا پر ناجائز دباؤ ڈال کر معافی حاصل کر لے گا اس کے سدِ باب کے لئے قرآن نے اعلان کیا کہ:۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ   (ترجمہ) جو قصاص کے حکم اور اس کی تخفیف میں
اَلِيْمٌ۔   زیادتی کریں ان کیلئے عذاب الیم ہے۔

یہاں چند امور کی وضاحت کی گئی ہے جو یہ ہیں :۔

خُون بہا یا معافی دے کر پھر انتقام لینے کی کوشش کرنا یا قاتل کا خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا اور مقتول کے وارثوں کے احسان کا بدلہ احسان فراموشی سے دینا جُرم ہے اور عدالت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں عدل و انصاف کرے۔ اسی طرح عدالت کا یہ بھی فرض ہے کہ جب صلحنامہ پہنچے تو جج اس امر کی تحقیق کرے کہ یہ معافی نامہ جائز طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے یا ناجائز طور پر۔ اگر راضی نامہ ناجائز دباؤ ڈال کر حاصل کیا گیا ہے تو عدالت اس راضی نامہ کو مسترد کرے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اولیاء مقتول نے بلا جبر و اکراہ بطیبِ خاطر معافی دی ہے تو پھر جج کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قاتل کی جان ہی لے۔ ایسی صورت میں قاتل کی جان لینا صراحۃً ظلم و تعدی ہوگا۔ ہاں معافی کی صورت میں عدالت کا فرض ہوگا کہ قاتل سے خوں بہا دلوائے اور اگر اولیاءِ مقتول نے بلا معاوضہ معاف کیا ہے اور معافی کے بعد پھر وہ قصاص یا فدیہ کیلئے مقدمہ دائر دائر کر دیں تو جج کا فرض ہوگا کہ اس صورت میں مقدمہ خارج کر دے کیونکہ اولیاء مقتول معاف کر چکے تھے اور معافی کے بعد قصاص یا فدیہ کا حق انہیں نہیں پہنچتا)

مفسرین نے کیا سمجھا یہاں ہم یہ بھی بتا دیں کہ مفسرین کرام نے آیۂ قصاص کی کیا تفسیر کی۔ اس سلسلے میں ہم تمام تفاسیر معتبرہ کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں قصاص کا جو طریقہ تھا اسلام نے اُس طریقہ کو نہیں اپنایا کیونکہ وہ ظلم تھا بلکہ اسلام نے وہ احکام دیئے جو عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔

(۱) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خُون کا بدلہ لو۔

شانِ نزُول یہ آیت اوس خزرج کے بارے میں نازل ہوئی، ان میں سے ایک قبیلہ قوت‘ مال اور شرف میں زیادہ تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے غلام کے بدلے آزاد کو۔ اور عورت کے بدلے مرد کو اور ایک

کے بدلے دوسرے قبیلے کے دو آدمیوں کو قتل کرے گا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ اسی قسم کی تعدی کیا کرتے تھے۔ ان کا رواج یہ تھا کہ آزادوں میں لڑائی ہوتی تو وہ ایک کے بدلے دو کو قتل کرتے۔ غلاموں میں ہوتی تو غلام کی بجائے آزاد کو مارتے۔ عورتوں میں ہوتی تو عورت کے بدلے مرد کو قتل کرتے اور محض قاتل کے قتل پر اکتفا نہ کرتے۔ عہدِ اسلام میں یہ معاملہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں عدل و مساوات کا حکم دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ مقتول کے بدلے صرف قاتل ہی کی جان لی جائے اسی لئے قتلیٰ کا لفظ فرمایا جو قتیل کی جمع ہے جس سے ہر قاتل بالعمد پر قصاص کا وجوب ثابت ہوا۔ خواہ اس نے آزاد کو قتل کیا ہو یا غلام کو مرد کو یا عورت کو (عامہ تفاسیر)

(۲) فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ — تو جسے اپنی بھائی کی طرف سے معافی ملے تو معروف کا اتباع کرے اور احسان کے ساتھ ادا کرے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس قاتل کو ولیٔ مقتول کچھ معاف کریں اور اس کے ذمہ کچھ مال لازم کیا جائے تو اس پر اولیاءِ مقتول تقاضا کرنے میں نیک روش اختیار کریں اور قاتل خون بہا خوش معاملگی کے ساتھ ادا کرے گویا اس آیت میں صلح پر مال کا بیان ہے۔

تفسیر احمدی مسئلہ اولیِ مقتول کو اختیار رہے کہ خواہ قاتل کو بے عوض معاف کرے یا مال پر صلح کرے اور اگر وہ اس پر [illegible] قصاص چاہے تو قصاص ہی واجب رہے گا (جمل) **مسئلہ** اگر مقتول کے تمام اولیا معاف کر دیں تو قاتل پر کچھ لازم نہیں رہتا۔ **مسئلہ** اگر مال پر صلح کریں تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور مال واجب ہوتا ہے (تفسیر احمدی) **مسئلہ** ولیِ مقتول کو قاتل کا بھائی فرمانے میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ قتل بہت بڑا گناہ ہے مگر اس جرم سے اخوتِ اسلامی و ایمانی قطع نہیں ہوتی۔ اس میں خوارج کا رد بھی ہے جو مرتکبِ کبیرہ کو کافر کہتے ہیں۔ (عامہ تفاسیر)

(۳) فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ — تو جو شخص معافی دینے کے بعد تعدی کرے اس کے

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ لئے درد و ہندہ عذاب ہے۔

مُفسّرین فرماتے ہیں اس آیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جاہلیت کے دستور کی طرح غیر قاتل کو قتل کرنا یا دیت قبول کرنے اور معاف کرنے کے بعد قتل کرنا یہ سب تعدّی ہے ظلم اور نا انصافی ہے لہٰذا اگر قصاص لیا جائے تو صرف قاتل ہی کو قتل کیا جائے اور اگر دیت قبول کر لی ہے یا معاف کر دیا ہے تو قاتل کو قتل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے (۴) وَلَکُمۡ اے عقل والو قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے کہ تم
فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ کہیں بچو!

اس آیت میں ایک دوسری جہالت کی تردید کی گئی ہے جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی ہے جس طرح اہلِ جاہلیت انتقام میں افراط سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو کے معاملہ میں تفریط کی طرف چلا گیا اور اس نے سزائے موت کو بالکل منسوخ کر دینے کو اختیار کیا۔ اور سزائے موت کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھا۔ قرآن نے اسی پر اہلِ عقل و خرد کو مخاطب کر کے تنبیہ کی کہ قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے اگر سزائے موت کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح قاتلوں کو کھلی چھٹی دی جائے تو انسانوں کی جانیں خطرہ میں پڑ جائیں گی اور نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ غرضکہ مُفسّرین کی تفاسیر یہ بتاتی ہیں کہ ظہورِ اسلام سے قبل جو قبائلی نظام تھا وہ سراسر ظلم و تعدّی پر مبنی تھا۔ اسلام نے قبائلی نظام کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس نظام کی تردید کی اور اس کی جگہ وہ احکام دیئے جو عدل و انصاف پر مبنی تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ قبائلی نظام میں خُوں بہا اور معافی کا رواج ہی نہ تھا۔ معافی کا قانون تو صرف اسلام نے نافذ کیا اور قتل تک کے مُعاملہ کو قابلِ راضی نامہ قرار دیا قتل کی قسمیں یہ ہیں

قتلِ شبہ عمد یہ قتل کی دوسری قسم ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ قصداً قتل کرے مگر اسلحہ یا جو چیز اسلحہ کے قائم مقام ہوں ان سے قتل نہ کرے مثلاً لاٹھی یا پتھر سے مار ڈالنا یہ شبہ عمد ہے اس صورت میں قاتل گنہگار ہے اور اس پر کفّارہ واجب ہے اور اس کے عصبہ پر دیت مغلّظہ واجب ہے جو تین سال کے عرصہ میں ادا کی جاتی ہے

قتل خطا اس کی دو صورتیں ہیں (الف) قاتل کے گمان ہی غلطی واقع ہوئی مثلاً کسی پر شکار سمجھ کر گولی

چلادی اور اسی کے مناسب تمام صورتیں اس میں داخل ہیں۔ (ب) فعل میں غلطی واقع ہوئی مثلاً نشانہ غلط ہوگیا گولی شکار کی بجائے کسی آدمی کو جا لگی۔ ہاتھ بہک گیا شکار سے پار ہو کر کسی کو لگی۔ دیوار سے ٹپا کھا کر لوٹی اور کسی کو جا لگی یا اس کے ہاتھ سے اینٹ یا لاٹھی چھوٹ کر کسی آدمی پر گری اور وہ مر گیا اور اسی کے مناسب تمام صورتیں اس میں داخل ہیں۔

قتلِ خطا کا حکم قتلِ خطا کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر کفّارہ واجب ہے اور اس کے عصبہ پر دیت واجب ہے جو تین سال میں ادا ہوگی۔ قتلِ خطا کی دونوں صورتوں میں قاتل کے ذمہ قتل کا گناہ نہ ہوگا کیونکہ وہ قصد و اختیار میں ہے البتّہ بے احتیاطی کا جرم ضرور ہے اور شریعت نے ایسے مواقع پر انتہائی احتیاط کی تلقین کی ہے۔

قتل بالا سباب یہ قتل کی پانچویں قسم ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کسی دوسرے شخص کی ملک میں س کی بغیرِ اجازت کنواں کھودا یا پتھر وغیرہ رکھ دیا اور کوئی شخص کنوئیں میں گر گیا یا ٹھوکر کھا کر مر گیا کو س قتل کا سبب وہ شخص ہے جس نے کنواں کھودا یا لکڑی یا پتھر رکھا۔

قتل بالا سباب کا حکم قاتل کے عصبہ پر دیت ہے مگر کفارہ اور گناہ نہیں کیونکہ ارادہ یہاں بھی نہیں ہے۔ البتہ ملکِ غیر میں تصرّف یہ علیحدہ جرم ہے۔ ان قتلوں کے احکام آیہ قتلِ خطا سے ماخوذ ہیں۔

قتلِ خطا سے متعلق آیات مَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۔

مسلمان کو نہیں پہنچتا کہ مسلمان کا خون کرے مگر ہاتھ بہک کر جو کسی مسلمان کو نادانستہ قتل کرے تو اس پر ایک مملوک مسلمان کا آزاد کرنا ہے اور خون بہا مقتول کے لوگوں کو سپرد کی جائے مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔

یعنی قتلِ خطا کی صورت میں قاتل کیلئے ایک مسلمان غلام کا جو اس کی مِلک میں ہے آزاد کرنا ضروری ہے اور خوں بہا مقتول کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیئے لیکن اگر مقتول کے ورثا خوں بہا معاف کر دیں تو پھر صرف غلام آزاد کر دینا کافی ہے۔ مومن غلام کو آزاد کرنا قتل کا کفّارہ اس لئے ہے کہ مقتول بھی

مومن ہی تھا۔

خُون بہا کی مقدار قرآن نے خُون بہا، کی مقدار مقرر نہیں کی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں اور بحکمِ قرآن نبی کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ وحیِ الٰہی کے اجمال کی تبیین اور اصول کے جزئیات کا تعیّن فرما دے، اسی منصبِ نبوّت کے تحت حضور علیہ السلام نے سو اونٹ یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائیں اور دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خُون بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انہی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مُبارکہ میں نقد خون بہا دینے والوں کیلئے آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم مقرر تھے حضرت فاروقِ اعظمؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے فرمایا اونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے لہٰذا ایک ہزار دینار سونے کے سکے میں اور بارہ ہزار درہم چاندی کے سکے میں خُون بہا، دلوایا جائے گا یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ گائے بکری کی خون بہا میں جو تعداد مقرر کر دی ہے وہ غیر مبدل ہے، اگر کوئی شخص بجنسہ اونٹ یا گائے یا بکری دینا چاہے تو اتنی ہی تعداد میں دینی پڑیں گی لیکن اگر قیمت دینا چاہے تو وہ بازار کے نرخ کے مطابق لی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ رسالت میں آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم میں سو اونٹ یا دو ہزار بکریاں یا دو سو گائیں آجاتی ہوں گی لیکن زمانۂ فاروقی میں قیمت چڑھ گئی تو آپ نے زیادہ قیمتِ خُون بہا کی مقرر فرما دی۔

○

مطبع : کنول آرٹ پریس۔ انار کلی۔ جان محمد روڈ۔ لاہور